سلسلۂ اشاعتِ امامیہ مشن پاکستان رجسٹرڈ لاہور نمبر ۱۰

نظامِ زندگی

از قلم

سید العلماء مولانا سید علی نقی النقوی مجتہد العصر

ہے۔ خرابی معدہ کی حالت میں سونے پر بڑے بڑے خوابوں کا دکھلائی دینا اسی کا نتیجہ ہے کہ جسمانی خرابی نے روح کے ادراکات پر اثر ڈال دئے۔ مراقی اور ملیخولیائی آدمی کے تصورات و تخیلات اور ادراکات بھی اسی کا نتیجہ ہیں۔

انسان کی روح وقت پیدائش سے آخر عمر تک ایک ہی رہتی ہے۔ نشوونما جسم کی صفت ہے روح کی نہیں ہے مگر قوائے جسمانی کی ترقیوں اور نشوونما کے ساتھ عقل میں کمال پیدا ہوتے رہنا اور پھر پیری کی حالت میں اکثر اوقات عقل کا بہک جانا بھی اس کی دلیل ہے کہ انسان کے قوائے جسمانی کا اثر قوائے روحانی اور ادراکات عقلی پر پڑتا ہے۔

معلوم ہوا ہے کہ انسان کی روح اور اس کے جسم میں اس دورِ حیات کے اندر چولی دامن کا ساتھ ہے لہٰذا ایک کے کمال و اعتدال کا اثر دوسرے پر پڑنا ضروری ہے انسان نام ہے مجموعۂ روح و بدن کا۔ اس لئے کامیاب مذہب وہ ہے جو اس سموئی ہوئی شکل کو قائم رکھتے ہوئے انسان کو ترقی کا موقع دے اور زندگی کے اصول بتلائے۔

ایسا مذہب جو ان میں سے ایک کو بالکل نظر انداز کر دے فطری مذہب نہیں سمجھا جا سکتا انسانی زندگی کا مقصد یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کی روح جسم سے جدا ہو جائے ورنہ وہ بچہ جو شکم مادر سے پیدا ہوتے ہی دنیا سے رخصت ہو گیا اپنے مقصدِ حیات کے اعتبار سے سب سے زیادہ کامیاب سمجھا جائے گا۔ مگر اس صورت میں سمجھ ہی نہیں آتا کہ اس کے وجود میں آنے ہی کی کیا ضرورت ہے؟ انسانی روح کا کمال پیدا ہو سکتا ہے تو ادراک و عمل سے۔ ادراک یعنی اعتقاد اور عمل یعنی اچھے افعال و صفات

کی انجام دہی یہی روحانیت کے کمال کے دو شعبے ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ دونوں انسان کے قوائے مادی سے متعلق ہیں۔ ادراک و شعور قوائے دماغی سے اور افعال واعمال اعضاء وجوارح سے متعلق ہیں۔

اب اگر روحانیت کی ترقی کے لئے ان آلات و اعضائے جسمانی کے تعطل کو روا رکھا گیا تو وہ خود وہ ادراکات و اعمال جو روحانی ترقی کا باعث ہیں یک لخت ختم ہو جائیں گے مثلاً ایسا مذہب جس کے نزدیک عبادت اور روحانی ریاضت کا طریقہ یہ ہے کہ انسان سانس روک کر مثل مردوں کے لیٹ جائے۔ تو اس مردہ نما زندگی سے نہ خلق خدا کی خدمت کا کوئی انجام پا سکتا ہے نہ ادراکات و احساسات میں ترقی کا موقع ہے کیونکہ یہ ایک بے ہوشی کا سا عالم ہوگا جس میں احساس و ادراک بھی معطل ہوگا۔

اسی طرح عبادت کا یہ طریقہ کہ انسان اپنے ہاتھ کو خشک بنالے تو اب اس ہاتھ سے اچھے کام جیسے گرتے ہوئے کو سنبھالنا۔ کمزوروں کی امداد کرنا۔ غریبوں کی خبر گیری کرنا سب ختم ہو گئے۔

پیروں کو شل بنالیا تو تمام نیک کام جو پیروں سے انجام پا سکتے تھے ختم ہو گئے پھر بھلا یہ عمل روحانی ترقی کا باعث کیسے سمجھا جا سکتا ہے؟ مذہبی تعلیم وہی صحیح تعلیم ہو سکتی ہے جو ہمہ گیر بن سکے۔ اگر ایک شخص کیلئے روحانی ترقی کا ذریعہ یہ سمجھا جائے کہ وہ ہاتھ کو اپنے خشک کرلے تو سب کے لئے روحانی ترقی کا ذریعہ یہ ہوگا۔ لیکن ذرا تصور تو کیجئے کہ اگر انسانوں کی تمام مردم شماری ہاتھوں کو اپنے خشک کرکے روحانی ترقی حاصل کرنے لگے تو کیا پھر عالم انسانیت کی زندگی قائم بھی رہ سکتی ہے اور کیا کچھ ہی دنوں میں صفحۂ ہستی انسان کے وجود سے خالی نہ ہو جائے گا۔

اب یہ دیکھئے کہ روح اور جسم کا ارتباط جس کا سابق میں تذکرہ کیا گیا صرف خالق کی قدرت کاملہ اور اس کی بندش کا نتیجہ ہے ورنہ روح اور جسم دو متضاد چیزیں ہیں جن کے خواص اور کیفیات بالکل الگ ہیں ایک ہے عرش سیر اور دوسرا فرش نشین۔

یہ صرف خالق کے ارتباط کا نتیجہ ہے کہ ان میں تعلق پیدا ہو گیا ہے اس لئے ان دونوں کو سمو دیا ہے اس لئے روح نے کچھ اپنے بلند صفات کو مادی جسم کی وجہ سے خیرباد کہہ دیا اور کچھ اپنے پست صفات کو جسم نے روح کے آنے سے بدل دیا مگر اس کے بعد بھی ان دونوں کے احکام وخصوصیات الگ الگ ہیں۔ روح کی غذائیں اور ہیں جسم کی غذائیں اور ہیں۔

روح کے قاتل زہر کچھ اور ہیں اور جسم کے قاتل زہر کچھ دوسرے۔ اب چونکہ روح اور جسم دونوں کی تربیت ضروری ہے اسلئے روح کو اس کی غذائیں پہنچانا چاہئیں اور جسم کو اس کی غذائیں۔ نہ اسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے نہ اسے فنا کے لئے چھوڑا جا سکتا ہے مگر یاد رکھئے کہ دو چیزیں جن کا ساتھ ہوتا ہے دو طرح کی ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ دونوں ہم پلہ اور برابر کی ہیں جیسے دو بھائی جنھوں نے برابر کے سرمایہ سے ایک تجارت شروع کی ہو تو ظاہر ہے نفع نقصان میں یہ دونوں برابر کے شریک ہوں گے۔ اور کسی طرح ایک کو دوسرے سے قابل لحاظ نہیں قرار دیا جا سکتا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ایک بلند مرتبہ ہو اور دوسرا اس کے مقابلہ میں پست مرتبہ جس طرح راکب ومرکب، ان دونوں کے ضروریات ہیں اور راکب کی غذا الگ اور مرکب کی الگ ہے۔ ایک شخص کو جوان کی پرورش کا ذمہ دار ہے اسے راکب کو اسکی غذا پہنچانا چاہئے اور مرکب کو اسکی غذا۔ لیکن اگر دونوں کے ضروریات میں تصادم ہو جائے

ایک ایسا وقت آجائے کہ یا تو راکب کی زندگی کا سامان کیا جائے یا مرکب کی تو اس صورت میں راکب کو مرکب پر ترجیح دی جائے گی اس کے معنی یہ ہیں کہ مرکب کا لحاظ اسی حد تک کیا جائے گا جب تک راکب کے لئے خطرہ نہ پیدا ہو ورنہ مجبوراً مرکب کا خیال نظر انداز کرنا پڑے گا۔

اسلام کے نزدیک روح اور جسم کی حیثیت یہی ہے۔ روح اس کے نزدیک اشرف ہے اس لئے اوّلیت رکھتی ہے اور جسم پست مرتبہ ہے اس لئے ثانوی درجہ رکھتا ہے۔

مگر یہ جسم اسی روح کے ارتقاء اور عمل کا ایک ذریعہ ہے سمجھ لیجئے کہ یہ اس کا مرکب ہے اسلئے روح کی خاطر سے ہی اس جسم کے ضروریات کا خیال رکھنا ضروری ہے لیکن یہ اس وقت تک جبتک کہ روح کی زندگی اور اس کے مفاد سے تصادم نہ ہو لیکن اگر ایسا موقع آجائے کہ جسم کو غذا پہنچانا روح کے لئے نقصان رساں ہو یا ہلاکت کا سبب ہو تو ضرور جسم کے خیال کو اس حد تک نظر انداز کر دیا جائے گا۔ اسی طرح اگر روح کا ارتقاء اور اس کی بلندی کسی خاص درجہ تک جسم کو تکلیف پہنچانے پر موقوف ہو تو اتنی تکلیف کو گوارا کر لیا جائے گا۔

یوں سمجھئے کہ جسم کی پرورش مقصد اصلی نہیں ہے بلکہ روح کی بقاء اور ترقی کی خاطر سے ہے۔

بقول شخصے "خوردن برائے زیستن است، نہ زیستن برائے خوردن"

اور یہ وہ نقطہ ہے جہاں سے اسلام اور مادیت میں جدائی ہوتی ہے کیونکہ مادیت مادہ کی ترقی کو مقصد اصلی قرار دیتی ہے اور اسلام جسم مادی کی پرورش کو بھی ضروری

سمجھتا ہے مگر اسلئے کہ روح کا اس سے تعلق ہے اور روحانی بقاء وارتقاء اسی پر موقوف ہے اور اس لحاظ سے مادی ضروریات کا پورا کرنا بھی روح ہی کی خاطر ہے اور اسی بناء پر ماخلقت الجن والانس الّا لیعبدون میں جو عبادت کو نصب العین قرار دیا گیا ہے وہ کھانے پینے سونے آرام کرنے کو بھی اپنے دائرہ میں لے لیتا ہے جبکہ ان کا مقصد صرف تن آسانی اور آرام طلبی نہ ہو بلکہ اس کے آگے کچھ اور ہو یعنی جسم کو فرائض کی ادائی اور انجام دہی کے قابل رکھنا جو انسانیت کا نصب العین ہے۔

اسلام نے مادی زندگی کا کس کس طرح خیال کیا ہے!

معلوم ہونا چاہئے کہ جو شے بذاتِ خود پسندیدہ ہو اس کا دوسرے کیلئے باعث ہونا پسندیدہ ہوگا۔ اگر مادی زندگی سے قطع تعلق خدا کی نگاہ میں روحانی ترقی کے لئے پسندیدہ ہوتا تو قتل نفس کوئی جرم نہ ہوتا کیونکہ اس ذریعے سے اس شخص کو اُس روحانی ارتقاء کے درجہ پر پہنچا دیتے ہیں جو مادی زندگی سے قطع تعلق پر موقوف ہے حالانکہ قتل نفس وہ گناہ عظیم ہے جس کو شرک کا ہم پلہ سمجھنا چاہیئے ارشاد ہوتا ہے ومن یقتل مؤمنا متعمداً فجزاؤہ جہنم خالداً فیہا وغضب اللہ علیہ ولعنہ واعدلہ عذاباً عظیما۔ اتنا ہی نہیں بلکہ نفس غیر کی حفاظت واجب قرار دی یہاں تک کہ اگر نماز ایسی افضل عبادت کا وقت تنگ ہو مگر اسوقت کوئی شخص غرق ہو رہا ہو تو اس کے بچانے کیلئے نماز کا اس وقت ترک کر دینا لازم ہے جیسے ہے دوسرے کی مادی زندگی کا تحفظ اور اپنی مادی زندگی، اس کے لئے خودکشی کو گناہ عظیم قرار دیا بلود کشی میں کیا ہوتا ہے؟ اسی مادی زندگی کا انقطاع؟ پھر اگر اسلام مادی زندگی کا لحاظ ہی نہ کرتا ہوتا تو وہ خودکشی کو گناہ کیوں قرار دیتا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ

اس نے حفاظتِ نفس کے لیئے اپنے احکام تک میں تبدیلیاں گوارا کیں۔ تقیہ کیا ہے؟
یہی کہ حفاظت نفس کے لیئے انسان بہت سی اُن باتوں کا ارتکاب کرتا ہے یا بہت
سے اُن فرائض کو ترک کرتا ہے جو عام حالات میں اس کے لیئے جائز نہیں تھا۔

کلمات کفر و شرک کا زبان پر جاری کرنا اور رسولؐ کی شان میں کلمات نازیبا استعمال
کرنا یہی وہ ہے جس کے متعلق آیت آئی ہے الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان
اس شخص کو کوئی گناہ نہیں جو بہ مجبوری ایسا کرے مگر دل اس کا ایمان پر مطمئن ہو۔ نماز
ایسی اہم عبادت لیکن تقیہ کے موقع پر وضو ہمارے طریقہ کے لحاظ سے غیر صحیح صورت
پر انجام پاتا ہے نماز غلط طریقے سے ہوتی ہے مگر جائز ہے۔ جب کہ حفاظت نفس اس
پر موقوف ہو پھر وقت گزرنے پر اور اندیشہ رفع ہونے پر ان نمازوں کی قضا تک بھی
لازم نہیں ہے اس لیئے کہ اپنے محل پر وہ حکم خداوندی کے مطابق انجام پا چکی ہیں۔

روزہ، اگر ایسا موقع آپڑا کہ آپ کو غروب شمسی ہی کے وقت یعنی جس وقت
اہلسنت روزہ افطار کرتے ہیں اسی وقت روزہ افطار کرنا پڑتا ہے تو یہ روزہ جائز
ہوگا اور پھر اس کی اعادہ اور قضا بھی لازم نہ ہوگی۔

زکوٰۃ اگر آپ کو مومنین مستحقین تک پہنچانے میں اپنے ماحول کی وجہ سے خطرہ
ہے اور اس لئے آپ کو دینا پڑتی ہے ان مسلمانوں کو جو آپ کے نزدیک نعمت
ایمان سے محروم ہیں تو تقیہ کی وجہ سے اُن ہی کو دیدینا برائت ذمہ کے لیئے کافی ہو
جائے گا۔

اسی طرح حج اور جہاد وغیرہ تمام شریعت کے شعبوں پر اس کا اثر پڑتا ہے
جتنے انفرادی گناہ ہیں وہ بھی اس تقیہ کے ماتحت جائز قرار پا سکتے ہیں۔ بے شک

دوسروں کی خوں ریزی کسی طرح جائز نہیں ہو سکتی اپنی جان کی حفاظت کے لئے

دوسرے کی جان لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔

کیا اس سے بڑھ کر مادی زندگی کا کوئی خیال ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ صحت جسمانی کے مفاد کی خاطر کس قدر احکام شریعت میں تبدیلیاں کی گئی ہیں۔

نماز ہی کو لے لیجئے کہ جو افضل عبادت ہے۔

اس کی ضروری شرط ہے طہارت مگر ایک ذرا پانی کے استعمال سے ضرر کا اندیشہ ہوا یا بیماری کا خوف پیدا ہوا اور فرض طہارت کا تبدیل ہو گیا غسل یا وضو کے بجائے تیمم کا حکم ہوا یہ کس لئے؟ صرف مادّی جسم کی صحت کی خاطر خود نماز میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنے سے غیر معمولی مشقت اور ناگواری ہو تو بیٹھ کر نماز پڑھے۔ بیٹھ کر نماز پڑھنے میں دشواری ہو تو لیٹ کر نماز پڑھے۔

یہ سب مادی جسم کے راحت و آرام کا خیال نہیں تو کیا ہے۔ سفر میں قصر نماز کا حکم بھی صرف اسی بنیاد پر ہے۔ ظاہر ہے کہ روح میں سفر اور حضر کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہوتا یہ سفر کی مادی مشقت ہی ہے جس کے لحاظ سے فرض کی مقدار میں تخفیف کر دی گئی۔

نماز کے شرائط میں سے لباس بھی ہے۔ ریشم کے کپڑے میں نماز مردوں کے لئے ممنوع قرار دی گئی ہے مگر جہاد کی حالت میں ریشمی لباس کی اجازت دی۔ صرف جسمانی مصلحت سے اس لئے کہ ریشم زخم کے لئے نافع ہے۔

خود روزہ کا حکم جسے بہت زیادہ انسان کے مادی پہلو سے تغافل کا حامل بتلایا جا رہا ہے اس میں کس قدر انسان کے حالات کی مراعات کی گئی ہے۔ اگر انسان مریض ہو

اور اندیشہ مضرت ہو تو روزہ کے فرض کو ساقط کر دیا گیا۔ اسی طرح ضعیف العمر لوگ جنہیں روزہ معمولی طور پر شاق و ناگوار ہو۔ یا زن حاملہ اور مرضعہ ان سب کو اجازت دی گئی کہ وہ روزہ کو ان حالات میں ترک کر دیں۔ سفر کی حالت میں بھی روزہ کو ساقط کیا گیا۔ کیا یہ انسان کی مادی زندگی کا ہی لحاظ نہیں ہے۔

معلوم ہوا کہ یہ کہنا بالکل حقیقت سے دور ہے کہ اسلام نے مادی زندگی کا کوئی لحاظ نہیں کیا ہے اور روحانیت کی دھن میں مادیت سے بہت حد تک تغافل برتا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں بلکہ اسلام نے قدم قدم پر مادی ضروریات کا لحاظ کیا ہے۔

بیشک وہ مادی راحت و آرام اور لذت و مسرت کی اتنی خاطرداری نہیں کر سکتا کہ فرائض کو بالکل نظر انداز کر دے اور انسان کو مطلق العنان بنا دے وہ اس زندگی کو بالکل قربان کر دینے کی دعوت دیتا ہے جب کہ بلند مقاصد کا تحفظ اور روحانیت کا ارتقاء جان کو خطرہ میں ڈالنے پر موقوف ہو جیسے جہاد کی منزل۔

نیز اس حد تک مشقت برداشت کرنے کو لازمی قرار دیتا ہے جو احکام و تکالیف کا فطری و طبعی لازمہ ہے۔

بیشک ان تکالیف شرعیہ میں مصالح و حکم مضمر ہوتے ہیں اور فوائد مترتب ہوتے ہیں

روزے کے روحانی فوائد

اب سوال کے اس جزو پر نظر ڈالنے کا وقت آیا ہے کہ اسلام نے تیس دن کے روزے کیوں قرار دئے اور کیا اس سے صرف روحانی ارتقاء مقصود ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ واجبات جو اصطلاحی حیثیت سے عبادت قرار

دئے گئے ہیں یعنی قصد قربت کی ضرورت ہے۔

ان سے روحانی ارتقاء ضرور مقصود ہے۔ اگر فقط جسمانی فائدہ مدنظر ہوتا تو ان کا کسی نہ کسی طرح انجام پا جانا خواہ بغیر قصد قربت کے ہو ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کیلئے کافی ہوتا مگر قربتہً الی اللہ اس عمل کے بجالانے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس کو روحانی ترقی کے لئے بجالاتے ہیں مگر اسلام کے جتنے عبادات ہیں وہ صرف تصور و خیال سے متعلق نہیں ہیں کہ اس میں اعضائے جسمانی کا کوئی تعلق نہ ہو بلکہ ان میں حرکات و سکنات یا کیفیات بھی قرار دئے گئے ہیں جو جسم سے متعلق ہیں اور اس لئے روحانی ارتقاء کے ساتھ ان میں مادی فوائد بھی مضمر ہیں۔

روحانی ارتقاء ادراک و معرفت سے پیدا ہوتا ہے اور شریف جذبات کے پیدا ہونے سے، اس کا تعلق اللہ سے بھی ہو سکتا ہے اور دوسرے افراد نوع یعنی بندگانِ خدا سے بھی اور مادی فوائد انفرادی بھی ہو سکتے ہیں یعنی وہ جو تنہا اس کی ذات سے وابستہ ہیں اور اجتماعی بھی ہو سکتے ہیں یعنی جو دوسرے بنی نوع تک پہنچتے ہیں۔

اب دیکھئے کہ روزہ ان حیثیتوں سے کتنے فوائد کا حامل ہے۔

سب سے پہلی چیز ارتقائے روحانی جو احساس عبودیت سے پیدا ہوتا ہے یہی عبادت کی اصل روح و حقیقت ہے اور اس سے انسان کو اپنے افعال و اعمال کی نگرانی کا خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کوئی ایسا کام نہ کرے جو خالق کی رضامندی کے خلاف ہو۔ حکم کی انتہائی بلندی واجب کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مرتبط ہونے میں ہے اور یہ ارتباط قوی ہوتا ہے۔ اپنی نیازمندی اور احتیاج کے اعتراف سے۔ جتنا اس کو اپنی حاجت مندی کا بارگاہ الٰہی میں زیادہ اقرار ہو گا اتنی ہی اس کی نگاہ آئندہ اس

کی جانب زیادہ مڑے گی اور دستِ توسّل اسکی طرف زیادہ بڑھے گا۔ اور جس قدر دامان
آرزو اس کا زیادہ پھیلے گا اسی قدر فیاض اور جواد مالک کی طرف سے عطا کی
بارش زیادہ ہوگی۔ اسی اعتراف نیازمندی کا نام ہے احساسِ عبودیت اور اسی درجہ
کے حصول کا نام عبدیت ہے جس کی ترقی انسان کا طرۂ امتیاز بلکہ معراجِ کمال ہے یہاں
تک کہ وہ ہستی جو کائنات کی ترقی کا آخری نقطۂ ظہور تھی۔ یعنی رسول اکرمؐ کی ذات
اُن کے درجہ کی بلندی کا سب سے زیادہ نمونہ جو عالمِ شہود میں پیش کیا گیا جس کا نام ہے
معراج۔ وہ بحیثیت نبی نہیں۔ بحیثیت رسول نہیں بلکہ صرف بحیثیت عبد تھا۔ اسی لئے
ارشاد ہوا سبحان الذی اسری بعبدہ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ
اس احساس عبودیت کا اثر زندگی کے ہر شعبے پر پڑے گا اور جو عمل اس احساس کا پیدا
کرنیوالا ہو وہ انسان کی زندگی کی عملی اصلاح کا باعث ہے ممکن ہے کہ کوئی عمل بذاتِ
خود جزئی حیثیت رکھتا ہو لیکن اگر اس نے انسان کے دل و دماغ کو اس احساسِ عبودیت
کا مرکز بنا دیا تو نتیجہ اس کا کلی ہوگا جیسا کہ ارشاد ہوا ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر
نماز بری باتوں سے باز رکھنے والی ہے یہ صرف اس احساس و انفعال کی بنا
پر جو نماز سے نفسِ انسان میں پیدا ہو سکتا ہے۔

اب دیکھئے کہ روزہ کی منفعت بھی قرآن مجید نے کیا بتلائی ہے پڑھئے آیت صوم

یاایھا الذین اٰمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون۔

"اے ایمان لانیوالو تم پر روزہ رکھنا واجب قرار دیا گیا ہے۔ شاید کہ تم میں تقویٰ
پیدا ہو جائے"۔ لفظی ترجمہ میں کہہ تو دیا میں نے "شاید" مگر اس شاید کا مطلب کیا ہے؟
یاد رکھنا چاہئے کہ تمنی، ترجی، استفہام اور تعجب کے الفاظ جب ہماری زبان پر جاری

ہوتے ہیں تو وہ کچھ خاص طرح کے کیفیات کے مظہر ہوتے ہیں۔

تمنا ایک ایسی شے کے مطلوب اور محبوب ہونے کا پتہ دیتی ہے جس کا حصول انسان کے قدرت اور اختیار سے باہر ہو۔ ترجی ایک ایسی شے کے وقوع کی امید یا گمان غالب کے اظہار کے لئے جس کا وقوع یقینی نہ ہو۔ اسی طرح استفہام و تعجب وغیرہ مگر جب ان الفاظ کا استعمال کلام الٰہی میں آئے تو وہ ان خصوصیات کے حامل نہیں ہو سکتے۔

وہ اگر تمنا کرے تو یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ وہ اس شے کے حصول کا آرزومند ہے مگر یہ اس کے بس سے باہر ہے وہ اگر امید کے الفاظ استعمال کرے تو یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ وہ نتیجہ سے بے خبر ہے۔

معاذ اللہ۔ نہ اس کی قدرت قاصر اور نہ اس کا علم کوتاہ ہے۔ پھر یہ ہونا چاہئے؟ بس اس نقص کے شائبہ کو دور رکھتے ہوئے جو ان الفاظ کے مفہوم کا حاصل معنی ہو وہ خالق کے کلام سے ثابت رہے گا۔

جب وہ تمنا کے الفاظ استعمال کرے تو یہ سمجھ میں آئے گا کہ اس امر کے حصول اس کو مدنظر اور مطلوب و محبوب ہے۔ مگر اس کو کسی وجہ سے وہ خود اپنی جبری طاقت سے کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے وہ آرزو کی لفظ استعمال کرتا ہے۔ مثلاً کافروں کی نسبت ارشاد ہو کہ لیتھم یومنون "کاش یہ لوگ ایمان لے آتیں"۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایمان لانا ان کا یقیناً خدا کو پسندیدہ اور مطلوب ہے۔ مگر اپنی حکمت اور نظام عالم کی مصلحت کی مجبوری سے جو متقاضی ہے کہ بندوں کے افعال ان سے اختیاری طور پر صادر ہوں وہ جبری طاقت سے سب کو ایمان کے راستے پر لانا بھی نہیں چاہتا اس

لئے وہ تمنا کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ یوں ہی اگر لعلّ کے لفظ کا استعمال ہو تو اس کے
معنی یہ ہونگے کہ اس شے کے حصول کے لئے جو بعد میں مذکور ہے تقتضی موجود ہے
بے شک شرائط مفقود ہونے یا موانع پیدا ہونے کا امکان ہے اسلئے لعلّ کی لفظ صرف
کی گئی اب اگر یہ لعلّ کسی خاص امر کے حکم کے بعد آئے تو یہ مطلب ہوگا کہ وہ قبل لا الاحکم
اس کے بعد والے نتیجہ کا مقتضی اور باعث ہے

اب یہ آیت کہ کتب علیکم الصیام..... لعلکم تتقون

جب اول کو آخر کے ساتھ مرتبط کر کے دیکھئے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ روزہ واجب
کیا گیا۔ اسلئے کہ وہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہونے کا مقتضی ہے۔

اب یہ ضمنی بات رہ گئی کہ "شاید" کی لفظ کیوں صرف کی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ
عدم علم کبھی تو واقع سے ناواقفیت کا نتیجہ ہوتا ہے اور کبھی مقام اظہار میں عدم علم خود
واقع کے تنوع اور اختلاف کا نتیجہ ہوتا ہے تشریح اسکی یہ ہے کہ روزہ یقیناً تقویٰ
کا باعث اور مقتضی ہے مگر بعض لوگ روزہ کو ایسے موانع کیساتھ بجالاتے ہیں جو
اس کا اثر پیدا نہیں ہونے دیتے بعض لوگ اس طرح انجام دیتے ہیں کہ اثر ناقص ہوتا
ہے اور کم ایسے ہیں جو اس طرح بجالائیں کہ اثر بالکل مکمل ہو جائے۔

خطاب خالق کا اگر فرداً فرداً سے ہوتا تو یقیناً وہ اپنے علم کی بنا پر ہر شخص کے متعلق
روزہ کا جو نتیجہ ہوگا اسے قطعی طور پر بیان کر دیتا۔ اسی طرح اگر مخاطب بہت سے افراد
الگ الگ اپنے خصوصیات انفرادی کے تفصیلی لحاظ کے ساتھ ہوں تب بھی
آسان ہے کہ ہر ایک کو الگ الگ اس کا نتیجہ بتا دیا جائے لیکن جب کہ تمام عالم انسانی
کو ایک عنوان عام کے ذریعہ سے مخاطب کیا جائے اور اس عنوان عام کے خصوصی افراد

میں تنوع و اختلاف ہے تو ضروری ہے کہ مقام اظہار میں تردد اور احتمال کا پردہ پڑ جائے
اسلئے نہیں کہ اُسکا علم ناقص ہے بلکہ اس لئے کہ اس عنوان کے لحاظ سے کوئی معین
نتیجہ خود حقیقت امر واقع میں نہیں ہے۔ وہ اگر یا ایھا الذین امنوا کے الفاظ سے مخاطب
کر رہا ہوتا کامل افراد انسانی مثلاً خاص محمد و آل محمد علیہم السلام کو تو اس وقت نتیجہ قطعی
ہوتا کیونکہ ان کا روزہ یقیناً اسی شان کا ہے جو تقوی کی صفت کا ضامن ہے لیکن
جب کہ مخاطب تمام جماعت مومنین ہے جس میں کامل بھی ناقص بھی تو کیسے قطعی طور پر
کہا جائے کہ تم روزہ رکھو گے تو تقوی کی صفت ضرور پیدا ہوگی بے شک یہ روزہ چونکہ
مقتضی اور باعث اس کا ہے اس لئے بطور غلبہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اس کے بعد تقوی کی
صفت پیدا ہونے کی امید ہے لیکن یہ تمہارا کام ہے کہ تم اس امید کو پورا ہونے دو اور
ایسے مواقع نہ پیدا کرو جو روزہ کی تاثیر کو نیست و نابود کر دیں یا ناقص بنا دیں۔ اب
دیکھئے کہ یہ تقوی کی صفت ہے کیا؟ جسے مقصد و نتیجہ صوم قرار دیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے
کہ یہ صفت اتنی بلند ہے کہ اسے عظمت انسانی کا معیار قرار دیا ہے ان اکرمکم عند اللہ
اتقاکم "تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ تقوی کی صفت رکھتا ہو" لوگ
ترجمہ کرتے ہیں کہ جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہو۔ مگر خدا سے ڈرنے کا کیا مطلب ہے؟
یاد رکھئے کہ ڈرا جاتا ہے تین قسم کی چیزوں سے ہے۔ ایک وہ کریہہ المنظر چیزیں جو اپنی
منافرت طبعی کے باعث ڈراونی ہوں جیسے غول بیابانی کا خیالی مجسمہ یا اس کی تصویر
دوسرے وہ جس کا سابقہ انسان کو نہ پڑا ہو اور پہلے پہل اُس کا سابقہ ہو رہا
ہو اس لئے طبیعت اُس سے غیر مانوس ہو اور وحشت کرتی ہو۔
تیسرے وہ جو بمقتضائے طبیعت آزار رساں اور تکلیف دہ ہو جیسے زہریلے اژ

کاٹنے والے جانور یا پھاڑ کھانے والے درندے ۔

اب دیکھئے کہ خدائے قدوس کی ذات میں کیا ان میں سے کوئی سبب بھی ڈرنے کا پایا جاتا ہے ؟ ہرگز نہیں ۔ خداوند کیساوہ تو جمالِ مطلق ہے اور انسان کا شروع سے کفیل اور سرپرست ہے اُسی کی نعمت عطا ہیں انسان نے آنکھ کھولی اور ایک ایک نفس کی منزل طے کرتا عمر کے اس نقطہ تک پہنچا پھر اگر باپ ماں کے ساتھ انسان کو انس و محبت ہوتا ہے تو اس سے زیادہ انس و محبت اپنے پروردگار کے ساتھ ہونا چاہیئے ۔ معاذاللہ وہ آزار رساں ہے اُس کے جابر و قہار ہونے کے وہ معنی ہرگز نہیں جیسے بادشاہوں کو جابر و قاہر کہتے ہیں یا جیسے غصہ ور آدمی سے آدمی ڈرتا ہے کہ بات نہ کریں ورنہ پھاڑ کھائے گا ۔ خدا تو وہ ہے کہ سبقت (رحمتہ غضبہ) اُس کی رحمت غضب کے آگے ہے وہ جابر و ظالم ہرگز نہیں بلکہ جابر العظیم الکسیر ہے (ٹوٹی ہڈیوں کا جوڑ دینے والا)

پھر ڈرنا کس سے کاہے کا ۔ حقیقت میں خدا سے انسان کو نہیں ڈرنا ہے بلکہ اپنے نفس سے ڈرنا ہے ۔ ان اعمال سے ڈرنا ہے کہ جو خداوند عالم کی مرضی کے خلاف ہوں اور جتنی خدا کی عظمت نگاہوں میں زیادہ ہو گی اتنا اپنے عمل کی کوتاہیوں کا اندیشہ زیادہ پیدا ہو گا اسی کا نام ہے تقویٰ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے قلب و دماغ کے متاثر ہونے کا عظمت الٰہی کا احساس ہے جب یہ اثر انسان کے نفس پر قائم ہو جائے گا تو انسان کے تمام افعال و اعمال میں توازن اور اعتدال اور خصوصی طور پر فرض شناسی کا ملکہ پیدا ہو جائے گا کیونکہ تمام افعال اگرچہ اعضاء انسانی کے اعتبار سے بٹے ہوئے ہیں اور جرائم بھی اسی لحاظ سے تقسیم ہیں ۔ کچھ نگاہ کے گناہ ہیں ۔ کچھ قوت سامعہ کے کچھ لامسہ کے ۔ کچھ ہاتھوں کے اور کچھ

پیروں کے۔ لیکن جیسا حکماء نے کہا ہے کہ النفس فی وحدتہا کل القوی نفس انسانی اپنی یکتائی کے ساتھ تمام قوتوں کا مجمع ہے جو طاقت نفس کو متاثر بنائے گی۔ وہ بہ وقت واحد تمام قوائے عملی اور کل اعضاء و جوارح پر اثر انداز ہو جائے گی۔ اور جو شے نفس کو متاثر بنا دے وہ انسان کے تمام افعال و اعمال میں فرض شناسی کا ملکہ پیدا کر دے گی جس کا دوسرا نام ہے تقویٰ۔ اسی لحاظ سے نماز کو کہا گیا ہے کہ ان الصلوٰۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر نماز بری باتوں اور گناہوں سے روکتی ہے اور اسی اعتبار سے روزہ کو تقویٰ کا سبب بتلایا گیا ہے۔ کہ کتب علیکم الصیام...... لعلکم تتقون

اب دیکھئے کہ روزہ کیونکر انسان کے نفس پر خداوندی عظمت کے اثر کو قائم کرتا ہے بات یہ ہے کہ انسان اپنی مادی ضروریات کو بہت کچھ سمجھتا ہے اور اسی قدر ان سے مرعوب ہے کہ وہ اپنے کو ان کے شکنجہ میں گرفتار پاتا ہے اور ان سے باز رہنا اپنے لئے انتہائی دشوار۔ کھانے پینے اور ضروریات زندگی کا کیا ذکر، غیر عقلی چیزیں جن کا انسان عادی ہو جاتا ہے جیسے سگریٹ بیڑی حقہ تمباکو وغیرہ ان کا انسان ایسا پابند ہو جاتا ہے کہ ان سے پرہیز کے تصور سے لرزہ براندام ہو جاتا ہے اور اس معاملہ میں ذرا کسی کی خاطر کم گوارا کر سکتا ہے، کوئی آپ کا دوست، کوئی عزیز، کوئی قابل احترام فرد آپ سے کہے کہ دن بھر فاقہ کرو، سگریٹ نہ پیو، حقہ نہ پیو، تمباکو نہ کھاؤ۔ میں ہرگز نہیں سمجھتا کہ آپ اس بارے میں کسی کی خاطر داری گوارا کریں گے۔ مگر روزہ میں خالق کی غیبی طاقت کا دباؤ ہوتا ہے جس کے اثر سے آدمی ان تمام باتوں سے جو عام طور سے اس کی ضروریات زندگی میں داخل ہیں باز رہتا ہے۔ انسان اس کے حکم کے مقابلہ میں اپنے ضروریات کو

یہ سمجھتا ہے اور اپنی تکلیف کو گوارا کر لیتا ہے یاد رکھئے کہ اسی احساس کی ترقی وہ ہے
جو ایک وقت میں انسان کو میدانِ جہاد میں اپنی جان تک کی قربانی پر آمادہ کر سکتی ہے
صرف اس لئے کہ خالق کی عظمت اور اس کے حکم کی اہمیت کا احساس اتنا ہے کہ انسان
اپنی زندگی بھی اس کے مقابلہ میں ہیچ سمجھنے لگا۔

بیشک یہاں پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ خود روزہ کا رکھنا اس احساس پر
موقوف ہے یعنی اگر انسان کے نفس میں خالق کی عظمت اور اس کی اہمیت کا اندازہ ہی
نہ ہو تو وہ روزہ رکھنے کی زحمت کیوں برداشت کرے گا۔ خود روزہ رکھنا اس احساس کا
نتیجہ ہے پھر روزہ اس احساس کے پیدا کرنے کا سبب کیسے سمجھا جا سکتا ہے مگر اس کا
جواب بالکل آسان ہے جس طرح جسمانی ورزش، ظاہر ہے کہ وہ طاقت پر موقوف ہے
اگر طاقت ہو ہی نہ تو انسان ورزش کیسے کر سکتا ہے لیکن خود ورزش طاقت کا سبب
بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک خاص درجہ تک قوت کا جسم میں ہونا ورزش کے لئے
پہلے سے ضروری ہے لیکن ورزش کے ذریعہ سے اُس طاقت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے
یوں ہی ایک خاص درجہ کا خداوند عالم کا اعتقاد پہلے سے ضرور ہوگا جب انسان روزہ
رکھے گا اسی لئے آیت صوم میں سرنامۂ حکم قرار دیا گیا ہے یا ایھا الذین امنوا اگر ایمان
ہی نہ ہو تو روزہ کی حکم کی تعمیل بھی نہ ہوگی۔ لیکن پھر روزے کے ذریعہ سے اس تصور اور
احساس میں ترقی ہوتی رہے گی۔ یہاں تک کہ وہ درجہ حاصل ہو جائے جو روزہ کے قبل ہرگز
حاصل نہ تھا۔

اب ایک دوسرا پہلو ملاحظہ کیجئے۔ جتنے جرائم ہیں اُن کا سرچشمہ ہیں انسان کے رجحانات
یعنی جس کا نام ہے جذبات، خواہ قوت غضبی کے ماتحت ہوں اور خواہ قوت شہوی کے

ماتحت اور انسان کی انسانیت ان رجحانات طبعی پر قابو حاصل کرنے میں مضمر ہے انسان وہ
نہیں ہے جسے غصہ آئے ہی نہ غصہ تو انسان کے لئے ایک ضروری چیز ہے جس سے بہت سے
قابل تعریف اقدامات بھی عمل میں آتے ہیں لیکن انسان وہ ہے جو غصہ کا بے محل استعمال نہ
کرے انسان وہ نہیں ہے جس کی قوت شہویہ بالکل مردہ ہو یعنی خواہشوں کی جس سا بیں
پیدا ہی نہ ہو۔ ایسا شخص تو مریض ہے۔ انسان وہ ہے جو اپنی خواہشوں کو صحیح طور پر
موقع محل کے دیکھنے کے ساتھ پورا کرے۔ انسان اور حیوان میں یہی فرق ہے۔ کھانے کی
خواہش حیوان کو بھی ہوتی ہے اور انسان کو بھی۔ مگر حیوان کو جب غذا کی خواہش
ہوتی ہے تو وہ جس کا سبزہ زار ملے گا۔ اس میں چرنے لگے گا۔ اگر انسان بھی ایسا ہوا
کہ بھوک لگی تو جس کا مال ملا کھا گیا تو اس میں اور حیوان میں کوئی فرق نہیں غصہ انسان
کو بھی آتا ہے اور حیوان کو بھی۔ مگر حیوان کو جب غصہ آئے گا تو وہ یہ نہیں دیکھے گا
کہ اگر سامنے چھوٹا بچہ ہے یا ضعیف العمر یا جوان اسے حملہ کر دینے سے مطلب ہوگا
اگر انسان نے بھی غصہ کے وقت موقع اور محل کی کوئی تمیز نہ کی تو اس میں اور درندہ میں
کیا فرق ہے۔ نہیں ہرگز نہیں انسان وہ ہے جو اپنے غیظ و غضب اور شہوت
اپنے تمام رجحانات اور خواہشوں پر خود تسلط قائم کرے اور قابو رکھے۔ انسان کی انسانیت
اسی سے شروع ہوتی ہے اور اسی پر ختم۔ اسلامی شریعت کے احکام تمام تر انسان کے اسی
جوہر کو ترقی دینے والے ہیں اس نے ایسے ذرائع اختیار کئے ہیں کہ انسان کو اپنی خواہشوں پر
زیادہ سے زیادہ قابو حاصل کرنے کا ملکہ حاصل ہو جائے اس کے لئے اس نے مختلف صورتیں
اختیار کی ہیں۔ جس طرح ورزش جسمانی میں آپ نے دیکھا ہوگا۔ کہ جسم کو مختلف پہلوؤں
کی طرف بار بار موڑا جاتا ہے اور ایک ہی وزن کو مختلف صورتوں سے اٹھایا جاتا ہے

اور مختلف طرح گردش دی جاتی ہے صرف اس لیے کہ جسم میں لوچ پیدا ہو۔ اور ارادہ کے
ماتحت جس طرح کی حرکت کی ضرورت ہے اور جس طرح کا وزن جس صورت پر اٹھانا
ہو اس کی صلاحیت پیدا ہو اسی طرح اسلام نے انسان کے نفس کی ریاضت کی ہے
اور مختلف صورتوں سے اس کو اپنی خواہشوں سے مقابلہ کرنے کی مشق کرائی ہے سب
سے پہلی صورت یہ تھی کہ مختلف طرح کے لذائذ میں اس نے کسی کے استعمال کا نوعی
طور پر سد باب نہیں کیا ۔ اگر اس نے پہلے ہی سے رہبانیت کی زندگی کی تلقین کی ہوتی
اور لذات دنیا سے علیحدہ ہی کر دیا ہوتا تو پھر بھی آسان تھا انسان کے جذبات
ردہ ہو جاتے اور ذوق طلب پیدا ہی نہ ہوتا مگر اس نے طعام کی جنس میں لذیذ سے
لذیذ غذاؤں کی اجازت اور اس طرح انسان کے کام و دہن کی حوصلہ افزائی کی ۔ پھر
بھی یہ کہہ دیا کہ خبردار حیوان وہ ہو جو ماکول اللحم اور ذبیحہ ہو ۔ اس طرح انسان میں فرض
شناسی کا جذبہ بیدار رہا اب انتہائی لذیذ گوشت سامنے موجود ہے مگر یہ علم ہوا
کہ وہ ذبیحہ نہیں ہے اور انسان نے منہ موڑا ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان شکم پری کی
خواہش میں قابو سے باہر نہیں ہوا اسی طرح بہتر سے بہتر کپڑا پہنے مگر حریر محض نہ ہو
اب آپ کو اچھے سے اچھے کپڑے کی فکر دامنگیر ہے پھر بھی ایک کپڑا نظر آتا ہے جو
ملکوک ہے بہت عمدہ کپڑا ہے ۔ دل ترسا جاتا ہے مگر آپ اس کی خریداری سے کنارہ
کشی کرتے ہیں ۔ اس لئے کہ وہ شرع کے خلاف ہے ۔

انتہا ہے کہ جیسا میں نے دوسرے موقع پر کہا ہے وہ خالص مادی خواہشیں جو
بہت کم انسان اور حیوان میں فرق باقی رکھتی ہیں ان کا تقاضا شدید ہے اور اسباب
سب مجتمع ، موانع سب برطرف ، دونوں دل راضی پھر بھی ایک پابند شرع انسان کو

خیال آتا ہے کہ جب تک وہ خاص الفاظ جن کا نام ہے صیغہ عقد زبان پہ جاری نہ ہو
جائیں اس وقت تک یہ حرام ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ جذبات نفس کے اس تلاطم
میں بھی انسان قابو سے باہر نہیں ہوا اور اُسے فرض کا احساس قائم ہے۔

یہ تمام صورتیں انسان کو اپنی خواہشوں پر قابو رکھنے ہی کے لئے نہیں مگر یہ وہ
چیزیں ہیں کہ جو مستقل طور پر ناجائز ہیں، ایک انسان جس نے تربیت اچھی پائی ہے
چونکہ کبھی ان اشیاء کے قریب نہیں گیا اس لئے اُسے ان کی طلب بھی نہیں ہے
بلکہ نفس میں اکثر ایک طرح کی نفرت ان چیزوں سے مرتکز ہو گئی ہے، وہ لاکھ شراب
کے دلاویز تذکرے سنے مگر اس کا دل کبھی اس طرف مائل نہیں ہوتا اس لئے کبھی
پی ہی نہیں وہ ڈاکٹروں کی زبانی سور کے گوشت کے فائدے سنتا ہے مگر کبھی رغبت
نہیں ہوتی۔ اگر کوئی اس کے استعمال کی دعوت دے تو ایک تنفر سا پیدا ہوگا۔
یوں ہی تمام معاصی جن سے مستقل طور پر علیحدہ رہا ہے ان کی آرزو بھی اس میں باقی
نہیں رہی ہے۔ قدرت نے چاہا کہ ایک ایسا موقعہ بھی آجائے جب وہ ہی حلال اور
جائز خواہشیں جنہیں انسان پورا کرتا ہے یکلخت محدود زمانہ تک جو کافی طولانی
بھی ہے روک دی جائیں۔ یہ ہے سخت آزمائش، شراب نہ پینا آسان ہے مگر گرمی کے
موسم میں دوپہر کے وقت جب تھوڑا سا راستہ چل کر دھوپ میں آئے بھی ہوں۔
ٹھنڈا پانی سامنے کورے گھڑے میں رکھا دیکھتے ہوئے اس پانی کی طرف رُخ نہ
کریں۔ بھوک کی شدت ہے اور روزہ کے آثار کا وقت۔ مگر کھانے کی طرف توجہ نہ ہو
حالانکہ ساعت شماری کیسی دقیقہ شماری ہو رہی ہے مگر یہ طریقہ شماری بھی فرض شناسی
کا نتیجہ ہے اور دوسری طرح کی بھی مادی خواہشوں کے اسباب مجتمع ہوں مگر فرض

سد باہ ہو گرم وقت میں خوشگوار حوض کے پانی میں اتریں اور دل چاہے کہ غوطے پر غوطے لگائیں مگر احساس مانع فرض ہے۔

یہ وہ چیز ہے جس سے انسان کی ہر خواہش اس کے قابو میں نظر آتی ہے اور تکرار عمل اور استمرار سے یہ ملکہ کی حیثیت حاصل کر لیتی ہے اور انسان اس انسانیت کے جوہر میں ترقی کرتا ہے جو اس کا طرۂ امتیاز ہے

اس کے علاوہ روزہ سے ایک اور شریف احساس انسان میں پیدا ہوتا ہے اور وہ غریبوں کی تکلیف اور ان کے دکھ درد کی قدر ہے۔ مالدار اور صاحب ثروت لوگ جنہیں ہر طرح کے ذرائع حاصل ہیں انہیں کبھی بھوک کی تکلیف کا اندازہ نہیں ہوتا اور اس لئے غریبوں کی قدر نہیں کرتے انہیں کبھی تکلیف بھی ہوئی تو سوئے ہضم اور خرابی معدہ کی۔ جبران خلیل جبران عرب کا ممتاز انشا پرداز تھا۔ اس نے ایک تمثیلی نقشہ میں اس حقیقت کو یوں ظاہر کیا ہے کہ میں راستہ سے گزر رہا تھا ایک دولتمند کو دیکھا پیٹ پر ہاتھ رکھے ہوئے ہے معلوم ہوا اس نے کھانا زیادہ کھا لیا۔ زیادتی غذا کی وجہ سے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔

آگے بڑھ کر ایک غریب کو دیکھا پیٹ پر ہاتھ رکھے ہوئے۔ معلوم ہوا یہ فاقہ سے ہے اور بھوک کی تکلیف سے پیٹ پر ہاتھ رکھے ہے۔ اگر وہ فاضل حصہ غذا کا جو دولتمند نے بلا ضرورت کھا لیا اس غریب کو مل جاتا تو دونوں اس تکلیف سے محفوظ رہتے نہ اس امیر کو درد شکم کی زحمت ہوتی نہ اس غریب کو بھوک کی تکلیف برداشت کرنا پڑتی۔

شریعت نے چاہا کہ ہر سال ایک ایسا موقعہ بھی آجائے جب مستقل طور پر کچھ عرصے کے لئے امیروں کو بھی بھوک کی تکلیف کا احساس ہو جائے اور غریبوں کی تکلیف کی قدر اور اس طرح انکی خبر گیری کرنا اختیار کریں۔

یہ روحانی فوائد کا شعبہ تھا اب ہو مادی فائدے۔ وہ ہیں نے کہا دو قسم کے ہیں ایک وہ جو اس شخص کی ذات کو پہنچ سکتے ہیں دوسرے وہ جو اجتماعی حیثیت رکھتے ہیں یعنی نوع کو پہنچ سکتے ہیں مادی فائدوں سے پہلا یہ ہے کہ انسان کے جسم کے اکثر اخلاط فاسدہ اور مواد ردیہ جو اعضاء و امعاء میں مجتمع ہو گئے ہیں وہ روزہ کے سبب سے تحلیل ہو جاتے ہیں۔ اطباء سے دریافت کیجئے فاقہ اکثر امراض کا مستقل علاج ہے اور بہت سی صورتوں میں نافع ہے۔

دوسرے یہ کہ معدہ جوام الامراض ہے اور اس لئے سرچشمہ صحت ہے اس کے اعتدال کو قائم کرنے کے لئے گیارہ مہینے تک جو مشین چلتی رہتی ہے اسے ایک ماہ تک کسی حد تک راحت لینے کا موقع دیا جاتا ہے اگر بے اعتدالی سے کام نہ لیا جائے تو تجربہ بتلاتا ہے کہ ماہ صیام کے بعد معدہ میں از سر نو ایک طاقت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کا نظام بہ نسبت پہلے کے بہت درست ہو جاتا ہے۔

تیسرے یہ کہ انسان کو محنت و مشقت کی عادت پڑتی ہے اور قوت برداشت میں اضافہ ہوتا ہے اور اس طرح انہیں جہد للبقاء کے مختلف حالات سے گزرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ سپاہیوں کی فوجی تربیت کا انداز یہی ہوتا ہے کہ انہیں مختلف سرد و گرم حالات کا مقابلہ کرایا جائے اور ان کو مشکلات کی مقاومت پر تیار کیا جائے۔

اجتماعی فائدہ جو روزہ سے حاصل ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک انسان اگر اسکی آمدنی ضروری مصارف سے زائد نہیں ہے اکثر قومی اور مذہبی کاموں میں حصہ لینے یا اگر

لوگوں کی خبرگیری کا حوصلہ رکھتا ہے مگر اپنے اور اپنے متعلقین کے کھانے کے مصارف سے اس کو کچھ بچتا ہی نہیں مصلحین قوم اکثر ایسے مقاصد کے لئے مہینہ میں ایک دن ترک لذات یا ہفتہ میں ایک دن گوشت نہ کھانے کی تجویز پیش کرتے ہیں۔

شریعت نے روزہ کا جو حکم دیا ہے اس میں انسان اگر خواہ مخواہ کے لذات کام و دہن کے پورا کرنے کا خیال نہ کرے اور صحیح طور پر عمل کرے تو ایک مہینے میں ہر انسان کے مصارف میں سے ایک وقت کے کھانے کے صرف کا بڑا حصہ پس انداز ہو سکتا ہے اور تمام قوم کا اگر یہ روز دن کا پس انداز کردہ حصہ جمع ہو تو بڑے بڑے ضروری مذہبی و قومی امور اس سے انجام پا سکتے ہیں۔

ائمہ معصومین علیہم السلام نے ان میں سے اکثر فوائد پر اپنے بصیرت افروز بیانات میں اپنی معجزنما الفاظ سے روشنی ڈالی ہے ذیل میں یہ احادیث درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) عن هشام بن الحكم انه سأل ابا عبد الله عن علة الصيام فقال انما فرض الله الصيام ليستوي به الغني والفقير وذلك ان الغني لم يكن ليجد مس الجوع فيرحم الفقير لان الغني كلما اراد شيئا قدر عليه فاراد الله تعالى ان يسوي بين خلقه وان يذيق الغني مس الجوع والالم ليرق على الضعيف ويرحم الجائع۔

ہشام بن الحکم کی روایت ہے انھوں نے امام جعفر صادقؑ سے دریافت کیا کہ روزہ کے حکم کا کیا سبب ہے حضرت نے فرمایا روزہ واجب قرار دیا گیا تاکہ ایک وقت ایسا بھی ہو جس میں مالدار اور فقیر برابر نظر آئیں بات یہ ہے کہ مالدار آدمی بھلا کاہے کو کبھی بھوک کی تکلیف کا احساس کرتا کہ فقیر پر رحم کرے کیونکہ مالدار جب کسی چیز کو چاہتا ہے تو وہ مہیا ہو جاتی ہے۔ خداوند عالم نے چاہا کہ اپنی خلق میں مساوات قائم کرے اور مالدار

کو بھوک کی تکلیف کا مزہ چکھا دے تاکہ وہ کمزور پر نرم دل ہو اور بھوکے پر ترس کھائے"۔

یہ وہ روحانی فائدہ ہے جو خلق خدا کے لحاظ سے حاصل ہوتا ہے۔

(۲) زرارہ کی روایت امام جعفر صادقؑ سے لکل شیٔ زکوٰۃ و زکوٰۃ الاجسام الصیام "ہر شے کے لئے ایک پاک کرنیکا ذریعہ ہوتا ہے اور جسم کے (اخلاط فاسدہ سے) پاک کرنے کا ذریعہ روزہ ہے"۔

یہ وہ پہلا مادی فائدہ ہے جو انفرادی زندگی سے متعلق ہیں نے عرض کیا تھا۔

(۳) محمد بن سنان کی روایت امام رضاؑ سے جو تحریری مسائل انہوں نے دریافت کئے تھے اس کے جواب میں تحریر فرمایا ہے۔

علۃ الصوم لعرفان مس الجوع والعطش لیکون العبد ذلیلا مستکینا ماجورا محتسبا صابرا و یکون دلیلا لہ علی شدائد الاخرۃ مع ما فیہ من الانکسار لہ عن الشھوات واعظا لہ فی العاجل دلیلا علی الاٰجل لیعلم شدۃ مبلغ ذالک من اھل الفقر والمسکنۃ فی الدنیا والاٰخرۃ روزہ کا سبب یہ ہے کہ انسان بھوک پیاس کی تکلیف سے واقف ہو تاکہ اس کے نفس میں جھکاؤ اور فروتنی پیدا ہو یعنی انسان میں قوت اور طاقت اور اقتدار کا جو غرور ہے وہ یہ دیکھ کر کہ ایک فاقہ میں اس کی کیا حالت ہو گئی ذرا کم ہو اور وہ مستحق اجر و ثواب بنے اور اس میں تکلیف کے برداشت کا ملکہ پیدا ہو اور یہ دلیل ہو آخرت کی سختی پر یعنی وہ سمجھے کہ جب دنیا کی ذرا سی تکلیف میں میرا عالم یہ ہے تو آخرت کی سختی میں کیسے برداشت کر سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ اسمیں نفسانی خواہشوں کو شکست دینا بھی مضمر ہے اس میں دنیا میں نصیحت حاصل ہوتی اور آخرت کے لئے رہنمائی تاکہ اس کو دنیا و آخرت دونوں کے فقر و فاقہ کی کیفیت کا اندازہ ہو۔ دنیا کے

فقر و فاقہ کا احساس ہوگا تو غریبوں کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوگی اور آخرت کے فقر کے احساس سے اپنے لئے توشۂ آخرت مہیا کرنے کی فکر ہوگی۔

اس حدیث میں متعدد ان پہلوؤں کی طرف اشارہ آگیا ہے جنکی تشریح سابق میں ہو چکی

(۴) فضل بن شاذان کی روایت میں جو امام رضاؑ سے ہے۔ علاوہ ان تمام امور کے یہ فقرہ بھی ہے کہ یکون ذالک واعظا لھم فی العاجل ورائضا لھم علی اداء ما کلفھم "ان کیلئے نصیحت کا باعث ہوتا ہے اور ایک طرح کی ریاضت یعنی تیاری کی مشق ہے ان فرائض کے ادا کرنے کے لئے جو اس کے ذمہ واجب الادا ہیں" یہ روحانی ارتقاء کا وہ اہم پہلو ہے جسے مبسوط بیان کے ساتھ پہلے پیش کیا گیا ہے۔

معلوم ہوا کہ روزہ میں روحانی فوائد ہیں اور مادی فوائد بھی اور یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ اسلام نے روحانیت کی دھن میں مادیت کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے

صوم وصال

اگر اسلام نے مادی پہلو کو روزہ کے باب میں نظر انداز کیا ہوتا تو صوم وصال کی اجازت دیدیتا۔ صوم وصال کیا ہے؟ دو دن یا اس سے زیادہ کا روزہ اس طرح کہ درمیان میں افطار نہ کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس میں تعب نفس بہت زیادہ ہوگا اور اگر روحانی زندگی کا معیار یہی ہو تو اس میں بلندی پیدا ہوگی مگر اسلام نے اس طرح کی روزہ کی اجازت نہیں دی اس کا روزہ صبح سے مغرب تک کی مدت سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

سفر میں روزہ کے ترک کا حکم

یہ بھی روزہ کے حکم کیساتھ مادی پہلو کا لحاظ ہی ہے کہ شریعت نے سفر کی حالت میں جس طرح
نماز کی چار رکعت کے بجائے دو رکعت رکھی ہے اسی طرح روزہ کے ترک کرنے کا حکم دیا ہے
ظاہر ہے کہ انسان کو جتنا اطمینان اور خاطر جمعی، راحت اور آرام گھر پر ہوتا ہے وہ سفر میں ہرگز
نہیں ہوتا اس بنا پر شارع مقدس نے انسان سے روزہ کی تکلیف کو اس حالت میں ساقط کر دیا
بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ یہ حکم قصر نماز اور ترک صوم کا اس زمانہ میں صحیح تھا
کہ جب سفر انتہائی دشوار گزار اور سخت تھا۔

اونٹ کا سفر اور ناہموار منزلیں اور سختی و صعوبت۔ اس زمانہ میں اس مراعات
کی ضرورت تھی لیکن اب جب کہ ریل اور موٹر کے سفر نے راستوں کو آسان کر دیا ہے اور
اگر سیکنڈ کلاس یا فرسٹ کلاس تک میں سفر کی نوبت آتی ہے تو اس حالت میں اس
مراعات کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مگر یہ خیال درست نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ
یہ لوگ اس قدیم زمانہ کے سفر کی زندگی کا اپنی روزمرہ کی شہری زندگی کے لحاظ سے موازنہ
کرتے ہیں تو وہ انتہائی دشوار نظر آتا ہے اور اس کے لحاظ سے اپنا سفر کچھ بھی نہیں
محسوس ہوتا لیکن اگر اس زمانہ کے لوگوں کی سفر کی زندگی کا انکی روزمرہ کی حضر کی زندگی
سے موازنہ کریں اور اپنے سفر کو اپنے حضر کی اطمینانی زندگی کے لحاظ سے دیکھیں تو معلوم
ہوگا کہ ان کا سفر ان کے حضر کے لحاظ سے وہی نسبت رکھتا تھا جو ہمارے سفر کو نسبت
ہمارے حضر کیساتھ ہے۔ اسلئے اگر انکے نظام عادت اور قوت برداشت کے لحاظ سے
ان کا سفر اس مراعات کا مستحق ہے تو ہماری پُر آرام حضری زندگی کے لحاظ سے ہمارے

سفر کو اس کا مستحق ہونا چاہیئے۔ اس کے علاوہ یہ دیکھیئے کہ جس طرح ہمارے زمانہ کے لحاظ سے ہمارے سفر کا معیار مختلف ہے اور تھرڈ سیکنڈ فرسٹ کے درجے میں اسی طرح سابق زمانے کے ذریعہ سفر کے لحاظ سے اس زمانہ میں بھی اسی طرح مختلف درجے ضرور تھے امراء اور ارباب دولت یقیناً اس طرح سفر کرتے تھے جو اس زمانہ کی زندگی کے لحاظ سے بالکل پُر آرام سمجھا جاتا ہوگا۔ اگر قصر کا سفر کسی غیر معمولی مشقت کے لحاظ سے ہوتا تو اس میں یہ تفریق ہونا چاہیئے تھی کہ غریب لوگ جو زحمت و مشقت کے ساتھ سفر کریں وہ اس مراعات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں لیکن امیر لوگ جو راحت و آرام سے سفر کرتے ہیں وہ اس کے مستحق نہیں ہیں جب ایسا نہیں کیا گیا اور عمومی طور پر یہ حکم نافذ کر دیا گیا تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس میں کسی غیر معمولی مشقت کا لحاظ نہیں کیا گیا بلکہ یہ حکم اس ذاتی ناگواری اور بے اطمینانی کے لحاظ سے نافذ کیا گیا ہے جو سفر کا طبعی نتیجہ ہے۔

اب اس سے بڑھ کر انسان کی مادی زندگی کا لحاظ اور کیا ہو گا؟

کاروباری زندگی پر روزہ کا اثر

اعتراض ہے کہ ایک بھوکا پیاسا شخص نہ تو دن بھر کام کر سکتا ہے اور نہ اسے کچھ کام کرنا چاہیئے کیونکہ اگر اس نے کوئی سخت جسمانی محنت کی تو اس کا اثر اسکی صحت پر پڑنا یقینی ہے لیکن ایک غریب مزدور ایسا کرنے سے قاصر رہا تو نتیجہ اسکی اقتصادی بدحالی اور مالی مشکلات ہوں گے۔

اس سوال کے کرتے وقت انسان تصور کرتا ہے اُسکی زندگی کا جو مزدور بسر کرتے ہیں جن میں ان کو دھوپ میں چلنا پھرنا اور کھڑا رہنا پڑتا ہے۔ انجن میں کوئلہ دینا یا بوجھ اٹھانا

پڑتا ہے۔ اس سب کا تصور کرتا ہے اپنی راحت پسند، آرام طلب طبیعت کے لحاظ سے
اور اسی بنا پر خیال کرتا ہے کہ وہ بڑا سخت کام ہے اور اس کے ساتھ روزہ ہرگز نہیں
ہو سکتا۔ لیکن غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص جس پیشہ کو اختیار کر لیتا ہے اور
اس کو اپنے نظام زندگی کا جزو بنا لیتا ہے تو اس کی قوت برداشت اسی کے لحاظ سے
بڑھ جاتی ہے۔ ہم جس وقت مئی جون کی گرمی میں کاریگروں کو دیکھتے ہیں کہ وہ دھوپ
میں کھڑے دیوار اٹھا رہے ہیں یا مزدور اینٹیں ڈھو ڈھو کر پاڑھ کے اوپر پہنچا
رہے ہیں تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم اگر ایک دفعہ اس سے آدھا بوجھا بھی
اتنی دور لے جائیں یا تھوڑی ہی دیر اس دھوپ میں کھڑے ہوں تو ہماری پیاس
کا التہاب انتہا کو پہنچ جائے اور ہم فوراً بیتاب ہو کر ٹھنڈے پانی کی طرف لپک
جائیں مگر کیا یہ لوگ اس دھوپ میں کھڑے ہو کر اور اس بوجھے کو اٹھا کر اسی طرح
بار بار پانی پیتے ہیں جس کی ہمیں اس موقع پر ضرورت کا احساس ہوتا ہے ہرگز نہیں
وہ پانی اسی طرح دن میں چند بار پیتے ہیں جس طرح گرمی کے موسم میں ہم پیتے ہیں اس
لئے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ وہ روزہ کسی صورت سے رکھ ہی نہیں سکتے۔ جس طرح ہمیں
اتفاق سے اگر ایسی غیر معمولی مشقت پڑ جائے تو ہم روزہ نہ رکھ سکیں گے۔ اور اگر
انھوں نے روزہ رکھا اور روزہ سے بالفرض صحت پر اثر پڑنے لگا تو ان پر سے اس
موقع پر روزہ کی تکلیف ساقط ہو جائے گی۔ اسی طرح جس طرح ہمیں اگر اندیشۂ مرض
پیدا ہو جائے تو روزہ کی تکلیف ساقط ہو جاتی ہے اس صورت میں اقتصادی بدحالی
اور مالی مشکلات کیا پیدا ہو سکتے ہیں؟ یہ تو جب پیدا ہوتے جب انہیں مجبور کیا جاتا کہ
کہ اگر صحت پر برا اثر پڑنے لگے تو وہ روزہ رکھے جائیں مگر اپنا کام ترک کر دیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے

مدت صیام

روزہ کے وجوب کو قرآن مجید نے مخصوص زمانہ کے ساتھ محدود کیا ہے شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن ھدی للناس وبینات من الھدیٰ والفرقان

خصوصیت سے اسی مہینہ کی تعین کے متعلق تو عقلی حیثیت سے کچھ نہیں سمجھ سکتے اور اس سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ بہر حال یہ مہینہ نہ ہوتا تو کوئی اور مہینہ ہوتا لیکن سوال یہ ہے کہ کسی ایک مہینہ کی تعین کی ضرورت کیا ہے۔

اس کے لئے ہمیں غور کرنا چاہئے کہ روزہ کے وجوب کے لئے کتنی صورتیں خیال میں آتی ہیں پہلی صورت یہ ہے کہ اس کے لئے کوئی زمانہ خاص ہوتا اور نہ کوئی تعداد مقرر ہوتی بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ جس کو جتنی قدرت ہو اور جتنا دل چاہے اتنے روزے رکھ لے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ تعداد مقرر ہوتی مگر کوئی کیفیت مقرر نہ ہوتی مطلب یہ ہے کہ اختیار دیا جاتا کہ سال بھر میں اتنے روزے پورے ہو جائیں۔ خواہ ایک ساتھ اور خواہ جدا جدا تیسری صورت یہ ہے کہ تعداد بھی مقرر ہوتی اور کیفیت بھی معین ہوتی کہ ایک ماہ مسلسل روزہ ہونا چاہئے مگر زمانہ مقرر نہ ہوتا بلکہ اختیار ہوتا کہ جب چاہو رکھ لو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ صورتیں کہاں تک مقصد تشریع کے مطابق ہیں۔

یاد رکھنا چاہئے کہ خاص مقصد قانون کا ضبط و نظام ہوا کرتا ہے اور اس ضبط و نظام کے ساتھ پھر یہ کہ فرض کا احساس قائم رہے مذہب کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان کی انفرادی زندگی میں مداخلت کرتا ہے اور پابندیاں عائد کرتا ہے یہی وہ چیز ہے جس میں سلطنت کا قانون مذہب کے سامنے سپر انداختہ ہوتا ہے اور شکست کھا جاتا ہے کیونکہ قانون سلطنت صرف اجتماعی اور خارجی زندگی پر پابندیاں عائد کرتا ہے اور اس کا دباؤ مادی اسباب

کا رہین منت ہے لیکن مذہب کا قانون براہِ راست دل و دماغ اور ضمیر پر قبضہ کر کے انسان
کو اسکی تنہائی کی زندگی اور ذاتی عادات و اعمال میں پابند بنا لیتا ہے۔ اس پابندی کے احساس
قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ مذہب کی جانب سے کچھ دباؤ طبیعت پر بطور ایک فرض
کے عائد ہوتا ہے اور اس کے ساتھ اس میں ہم رنگی و یک جہتی ہو تاکہ افراد جامعہ اس کے ذریعہ
سے ایک رشتہ میں منسلک نظر آئیں۔ اسلام نے اپنے تعلیمات کے ہر شعبہ میں اس احساس
فرض کے قائم کرنے اور ہم رنگی و یک جہتی پیدا کرنے کا خاص اہتمام کیا ہے۔ نماز کے بیان میں
قبلہ اور وقت وغیرہ کے باب میں اس پر کافی تبصرہ کیا گیا ہے۔ مذکورہ بالا صورتیں ان
خصوصی مقاصد کے اعتبار سے بالکل ناکام ہیں۔ پہلی صورت کہ کوئی تعداد روزوں کی مقرر
نہ ہوتی تمام حیثیتوں سے ناقص اور ناقابلِ قبول ہے۔ اول تو اس میں فرض کا احساس جس کے لئے
طبیعت پر ایک دباؤ پڑنے کی ضرورت ہے پایا نہیں جاتا۔ جب معاملہ ہمارے طاقت و
اختیار سے وابستہ ہو گیا تو ظاہر ہے کہ ہم میں سے ہر شخص کم سے کم مقدار اپنے ذمہ واجب الادا
قرار دے گا۔ اس صورت میں ضبط و نظام بھی قائم نہیں ہوتا اور جماعت کی ہم آہنگی بھی قائم
نہیں رہتی۔ کیونکہ کوئی رکھتا ہے سال میں دس دن اور کوئی پانچ دن اور کوئی ایک دن۔
یہ تو کوئی قانونی پابندی نہیں ہوئی بلکہ ایک خوشی کا سودا ہوا اس سے وہ روحانی اور
مادی فائدہ ہر گز پورے نہیں ہو سکتے۔ جو تشریح صوم کے اصلی مقاصد ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ تعداد مقرر ہوتی مگر کیفیت معین نہ ہوتی۔ اس میں تعداد کے مقرر
ہونے سے فرض کی شان تو پیدا ہو گئی مگر کیفیت معین نہ ہونے کی وجہ سے ضبط و نظام نہیں رہا اور
افراد کی ہم آہنگی نہیں۔ اب کوئی ایک ساتھ رکھ رہا ہے کوئی الگ الگ کوئی ایک وقت
میں کوئی دوسرے وقت میں۔

نظام زندگی

تیسری صورت کہ کیفیت معین ہوتی مگر زمانہ نہ مقرر ہوتا۔ اس میں بھی یہ دو نقص جوہر مفقود ہیں۔ نہ ضبط و نظام ہے۔ نہ افراد کی یک جہتی۔ اب سب ۳۰ ہی دن کے روزے رکھ رہے ہیں مگر کوئی شعبان میں، کوئی شوال میں کوئی اور زمانہ میں۔

اس میں وہ اجتماعی شان کہاں جو اب ماہ رمضان میں پیدا ہو جایا کرتی ہے۔

مثل مشہور ہے "ان البلیۃ اذا عمت طابت" "مرگ انبوہ جشنے دارد"۔ اس اجتماعی شان کی وجہ سے روزہ کا فرض باوجود ناخوشگوار ہونے کے خوشگوار ہو جاتا ہے اس لئے کہ سب ایک رنگ میں ہیں۔ بلکہ تمدنی صورت ناخوشگوار بن جاتا ہے اور کبھی دوسرے زمانہ میں جو قضا وغیرہ کا روزہ رکھا جاتا ہے وہ اتنا طبیعت پر گراں گذرتا ہے جس کو رکھنے والوں کا دل جانتا ہے صرف اس وحشت اور پریشانی کی وجہ سے جو اکیلے ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

اب اس سوال پر نظر ڈالئے جو بطور اعتراض آپ کے سامنے پیش ہے وہ یہ ہے کہ:۔

"میں تسلیم کرتا ہوں کہ روزہ مادی نقطۂ نظر سے بھی مفید چیز ہے اور طبی لحاظ سے بھی لیکن ایک ماہ کے روزہ کا تک سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر ہفتہ میں صرف ایک روز کا روزہ ہو تو انسان آسانی سے اپنے روزمرہ کی کارروائیاں جاری رکھ سکتا ہے کیونکہ ایک روز کا روزہ تو ہمارے خون کی اصلاح۔ معدہ کی اصلاح اور سسٹم کی اصلاح کر سکتا ہے لیکن ایک ماہ کا مسلسل روزہ جسم کو دماغی اور جسمانی طور پر کمزور کر دیتا ہے"!

یہ ایک چوتھی صورت ہے جو پیش کی گئی ہے۔ اور یہ اُن تمام خرابیوں سے پاک ہے جو پہلے ذکر کی گئی ہیں یعنی اس میں فرض کا احساس بھی قائم رہتا ہے ضبط و نظام بھی ہے اور ہم آہنگی و یک جہتی بھی۔ مگر اس میں ایک بہت بڑی خرابی ہے وہ یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو قریبی وقت میں بار بار عود کرے اور واپس ہوتی رہے طبیعت اسکی عادی

ہو جاتی ہے اور پھر اس کا مطلوبہ اثر حاصل نہیں ہوتا۔ اگر ہفتہ میں ایک بار روزہ کا حکم
دیا جاتا تو شروع میں کچھ دن تو اس سے خون معدہ اور سسٹم کی اصلاح ہوتی۔
لیکن کچھ دن کے بعد جب طبیعت اسکی عادی ہو جاتی تو وہ ان مقاصد کے لیے ناکامیاب
ثابت ہونے لگتا۔ اب ضرورت ہوتی ہفتہ میں دو دن فاقہ کرنے کی اور یوں ہی اسمیں اضافہ
ہوتا رہتا یہاں تک کہ انسان اپنے معدہ کی خرابی کی وجہ سے پریشان ہو جاتا لیکن امتداد
وقت اور طول مدت کے ساتھ اگر تکرار ہو تو طبیعت سے چونکہ پہلا اثر وقت کے طولانی
ہو جانے سے رخصت ہو جاتا ہے اس سے دوبارہ پھر ویسا ہی اثر ہوتا ہے جیسے پہلے ہوتا تھا
گیارہ مہینہ کا کام کیا ہوا معدہ جب ایک مہینہ تک راحت لیتا ہے اور اس سے کام کر
لیا جاتا ہے تو وہ ایک نئی زندگی اور روح سے معمور ہو جاتا ہے اور اس سے جسمانی نظام
پر ایسا اچھا اثر پڑتا ہے کہ گویا از سر نو اس کی تجدید ہو جاتی ہے اس کے علاوہ جو روحانی فوائد
ہیں روزے کے وہ بھی اس میں حاصل نہیں ہو سکتے کیونکہ ہر ہفتہ میں ایک بار اس کی عادی
ہو جانے کے بعد طبیعت اس میں کوئی کلفت اور ناگواری محسوس نہ کرے گی اور وہ اتوار یا جمعہ
کی چھٹی کے مثل ہر ہفتہ میں ایک رسمی چیز بن جائے گی۔

اس کے علاوہ تسلیم کرنے کی صورت میں کہ روزے سے انسان کے کاروبار اور دماغی کاموں
میں کمی ہو جاتی ہے موجودہ حالت میں اس کمی کا معاوضہ گیارہ مہینہ کی مسلسل جدوجہد سے
ہو سکتا ہے لیکن اگر ہر ہفتہ میں ایک دن کا بھوکا پیاسا رہنے کو کہا گیا ہوتا جیسا تجویز کیا جا رہا
ہے تو پھر کوئی کام ہم نہ کر سکتا۔

روزے پر بحث حفظانِ صحت کے نقطۂ نظر سے

کہا جاتا ہے کہ "روزہ سے ہم میں ضعف بڑھ جاتا ہے جس کی وجہ سے ہم ہر وقت مختلف امراض کے جراثیم قبول کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ کیونکہ اطبا کی رائے میں انسان کی بیماری اتنی خطرناک نہیں جتنا اس کا ضعف۔ اس لئے ایک ماہ کے مسلسل روزے طبی نقطۂ نظر سے بھی مضر ہیں"

مگر کیا یہ صحیح ہے؟ یاد رکھئے کہ مشاہدہ سب سے بڑی دلیل ہے۔ مشاہدہ سے ثابت ہوا ہے اور موجودہ زمانہ کی تحقیقات نے اعتراف کیا ہے کہ سب سے زیادہ عمر طبقہ روحانیین یعنی علمائے مذہب کی ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ لوگ زیادہ تر ان ریاضتوں کے پابند ہوتے ہیں جو جسمانی حیثیت سے ناتوانی کا باعث ہوتی ہیں۔

اکثر وہ لوگ جن کی عمر روزوں میں گزرتی ہے اُن سے زیادہ زندہ رہتے ہیں اور ان سے زیادہ ذہنی اور علمی آثار چھوڑ جاتے ہیں کہ جو روزہ کے پابند نہیں ہیں یا جنھوں نے کبھی رکھا ہی نہیں۔

روزے پر بحث اقتصادی نقطۂ نظر سے

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "اقتصادی نقطۂ نظر سے بھی روزوں سے مسلمانوں کو نقصان پہنچتا ہے کیونکہ مسلمان رمضان میں جس بری طرح اسراف کرتے ہیں وہ بیان سے باہر" مگر یہ خیال بالکل غلط ہے حقیقت تو یہ ہے کہ روزہ اقتصادی حیثیت سے اُن لوگوں کے لئے جن کی آمدنی اُن کے مصارف روزمرہ کے برابر ہے پس انداز کرنے کا ذریعہ ہے مگر مشکل یہ ہے کہ مسلمانوں میں اقتصادی شعور پیدا ہی نہیں ہوا ہے یہ تو روپیہ صرف کرنے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں اس لئے کوئی چیز کتنی ہی ان کے لئے اقتصادی طور پر نفع رساں ہو وہ بھی ان کی ذہنیت

کی بدولت انتقادی حیثیت سے مضر ہوجاتی ہے۔ اس میں اصل اس شے کا قصور نہیں بلکہ انکی غلط ذہنیت اور غلط طرز عمل کا قصور ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مسلمان مجبور ہیں کیونکہ ایسا نہ کریں تو ان کی صحت قائم نہیں رہ سکتی بدقسمتی سے یہ بھی غلط ہے۔ مسلمانوں کا اصراف اپنی صحت کی بقا کے لئے نہیں ہوتا بلکہ اکثر ایسی غذاؤں کا استعمال کیا جاتا ہے جو صحت کے لئے مضر ہوتی ہیں۔ بلکہ افطاری میں اکثر متضاد خاصیت کی چیزوں کا استعمال اور غذا میں تداخل کرنا یعنی بھر سے پیٹ بھرنا اور بے اعتدالی سے کام لینا یہ تمام وہ امور ہیں جن سے بیماری پیدا ہوتی ہے۔ شرع نے تو بڑی سادہ چیزیں افطار کے لئے بتائی ہیں جیسے آب گرم یا رطب۔ مگر یہاں افطاری میں جب تک دس پانچ چیزیں نہ ہوں روزہ کھلتا ہی نہیں۔ یہ کوئی صحیح طریقہ نہیں ہے۔

آپ کے سامنے ہے رہنمائے دین حضرت امیرالمومنینؑ کی افطاری کا سامان جیسے جناب ام کلثوم نے بیان فرمایا ہے اس آخری روزہ کے متعلق جس کے بعد حضرت کو شاید کسی دوسرے افطار کا موقع نہیں ملا۔ وہ مہینہ وہ تھا جس میں حضرت نے شہادت پائی۔ اس میں حضرت نے اپنا معمول یہ رکھا تھا کہ باری باری ایک دن حضرت امام حسنؑ اور ایک دن حضرت امام حسینؑ اور ایک دن عبداللہ بن جعفر کے یہاں افطار فرماتے تھے۔ آخری دن جس کے بعد آپ کے سر مبارک پر ضربت لگی آپ حضرت ام کلثوم کے مہمان تھے۔ میرا خیال ہے کہ اس سے مراد حضرت زینب ہیں جو عبداللہ بن جعفر کو منسوب تھیں۔ بہرحال افطار کے وقت جناب ام کلثوم نے ایک طبق میں گردہ نان، نمک اور ایک پیالہ دودھ کا حاضر کیا۔ بس یہ افطاری تھی بادشاہ دین و دنیا کی۔ حضرت نے اس کو بھی منظور نہ فرمایا۔ اور ام کلثوم کو حکم دیا کہ دودھ کا پیالہ ہٹا لیں صرف نمک سے آپ نے چند لقمے روٹی کے نوش فرمائے۔ اس کے پیش کرنے سے یہ مطلب نہیں کہ

مسلمان بالکل اسی کی پیروی کریں اور حقیقی معنی میں نان فرنگ ہی پہ اکتفا کریں۔ مگر اس مثال سے کچھ تو سبق لیں اور جہاں تک ممکن ہو سادگی اور کفایت شعاری سے کام لیں۔ یہ کہنا کہ "نفسیاتی حیثیت سے وہ قابل عفو ہیں کیونکہ دن بھر کے فاقہ کے بعد انسان کی طبیعت لامحالہ کچھ اچھی غذا کھانے کو چاہتی ہے"؛ یہ "لامحالہ" کوئی چیز نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے نفسیات انسانی کی تشکیل عادت اور ذہنیت کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔

اگر مسلمانوں کو حفظانِ صحت، اقتصادی حیثیت اور کفایت شعاری کا جذبہ پیدا ہو جائے زبھر دل ہی چاہنے لگے کہ اس وقت دو چیزوں کے بجائے ایک ہی چیز کھائیں اور خواہ مخواہ ضرورت سے زیادہ صرف نہ کریں۔

مگر ان کی ہر بات فضول خرچی پر مبنی ہے اس لئے جیسے لباس میں اولوالعزمی پائی جاتی ہے ویسے ہی کھانے کے معاملے میں "چھچھورا پن" اس میں دنیا کی کشمکش بہت حد تک کمی پیدا کر چکی ہے اور جتنی یہ بات باقی ہے اس میں لامحالہ اور کمی پیدا ہو گی۔ مجبوریاں خود کم کرا دیں گی، پھر یہ "لامحالہ" رکھا رہ جائے گا اور اس وقت روزہ کا اقتصادی مقصد حاصل ہو گا۔

تمام عبادات میں روزے کی فضیلت و خصوصیت

تمام عبادات میں روزہ کو خاص اہمیت و خصوصیت حاصل ہے حدیث قدسی میں آیا ہے الصوم لی وانا اجزی بہ "روزہ مجھ سے مخصوص ہے اور میں اس کی جزا دوں گا"۔ ظاہر ہے کہ ہر عبادت خدا ہی کے لئے ہوتی ہے مگر جتنی عبادتیں ہیں ان میں ریاء و سمعہ کی گنجائش ہو سکتی ہے یعنی کبھی وہ دوسروں کے دکھانے یا سنانے کے لئے انجام پاتی ہیں مگر روزہ

اگر ہو گا تو وہ خدا ہی کے لئے ہو گا۔ اس لئے کہ اس میں نہ دکھانے کا محل ہے نہ سنانے کا۔ اُس میں حرکات و افعال نہیں کہ جو دیکھنے میں آئیں۔ اذکار نہیں کہ سنانے میں آئیں وہ تو مخصوص اشیا کے ترک کا نام ہے اور ترک دیکھنے کے قابل نہیں ہوتا۔ اسی کا نتیجہ ہے جو ارشاد ہوتا ہے وانا اجزی بہ میں اس کا بدلہ دوں گا۔ ہر عبادت کا بدلہ وہی دیتا ہے مگر دوسری عبادتوں کی ظاہری صورت کا معاوضہ دوسروں سے بھی مل سکتا ہے مثال کے طور پر یہ ہے کہ کوئی رئیس کسی شخص کو مامور کرے کہ تم آکر میرے بچوں کے سامنے نماز پڑھا کرو تاکہ انہیں نماز پڑھنا آجائے۔ اس صورت میں میں تم کو اتنا اتنا معاوضہ دوں گا۔ مگر روزہ ایسی چیز نہیں ہے جس کا معاوضہ کوئی اور دے سکے۔ وہ اگر ہو گا تو خدا ہی کے لئے ہو گا اور وہی اس کی جزا دے گا۔

رہ گئے وہ روزے جو بطور نیابت رکھے جاتے ہیں اور ان میں اجرت لی جاتی ہے وہاں اُجرت کا تعلق نیابت سے ہے۔ اور روزہ کی قبولیت بحیثیت عبادت اس شخص کے لئے ہے جس کے وہ روزے ہیں اس لئے روزہ کا ثواب اُس کو ملے گا اور اس ثواب کا دینے والا خدا ہی ہے۔

مفطرات صوم

روزہ کی یہ خصوصیت ہے کہ جتنے احکام شرعیہ ہیں ان کی تعمیل میں کسی ایک جذبۂ نفس سے مقابلہ ہے مگر روزے میں بہت سے نفسانی جذبات کا مقابلہ ایک ہی ساتھ کرنا پڑتا ہے حسب ذیل اشیا۔ وہ ہیں جن کا ترک کرنا روزے میں ضروری ہے اور آپ غور کیجئے کہ ان میں سے اکثر اشیاء۔ انسان کی عام معاشرت میں کس قدر دخیل ہیں

اور ان خواہش انسان کو بہ تقاضائے فطرت کس درجہ شدید ہے۔

(۱) کھانا پینا بقصد و ارادہ، انسان کو یوں چاہے بھوک نہ لگے مگر کسی کے روک دینے پر تو ضرور اشتہا پیدا ہوتی ہے۔ اور پیاس، اسے نہ پوچھئے خصوصیت کے ساتھ گرمی کے دنوں میں۔ لو اور دھوپ ہیں۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ الصوم فی الحر جہاد گرمی میں روزہ رکھنا ایک بڑا جہاد ہے۔ بیشک جاڑوں میں غنیمت بالمردہ بے لڑے بھڑے کا مال غنیمت ہے۔

(۲) بقصد و ارادہ اپنے کو مبتلائے جنابت کرنا، خواہ کسی صورت سے ہو۔ ظاہر ہے کہ اس سے بچنے کے لئے بہت سے اوقات نفس پر بڑا جبر کرنا پڑے گا۔ بلکہ بعض اوقات بعض اشخاص کو نگاہ اٹھا کر غور کے ساتھ دیکھنے تک سے خواہ اپنی شریک زندگی تک ہو کیوں نہ احتراز کرنا پڑے گا۔

(۳) رات کو اگر ارادی یا غیر ارادی طور پر ایسا اتفاق ہو تو پھر صبح کے پہلے ہی غسل کرنا لازم ہے اور اسی حالت پر باقی رہنا بطلان صوم کا باعث ہے۔ اب کچھ نہ پوچھئے اس نفسانی جبر کو جو ایسے وقت میں جب کہ طرب و نشاط اپنے شباب پر ہے۔ اور دل مسرت کی گھٹا چھائی ہوئی ہے اور موذن کی بانگ سحر کا دھڑکا فرض شناس شخص کو اس بساط مسرت کے الٹنے پر مجبور کرتا اور لے جاتا ہے غسل کرنے یا بصورت عدم قدرت تیمم کرنے کا فریضہ ادا کرنے کی جانب، اگر سونے میں ایسا عالم ہو تو آنکھ کھلی اور اٹھنا ضروری۔ یہ نیند بے چین کرنا بھی نیند کی متوالی طبیعتوں کے لئے بڑا ہی جہاد ہے

(۴) غبار غلیظ کو حلق کے نیچے اترنے دینا۔

(۵) عمداً استفراغ کرنا، بعض اوقات اس کا روکنا بھی ناگواری طبع کا بڑا باعث ہو سکتا ہے

(۶) کسی سیال چیز کے ساتھ احتقان یعنی امل لینا اگر طبی حیثیت سے ضروری نہیں ہوگیا ہے اور صرف اس کے چھوڑنے میں کچھ جسمانی تکلیف یا درد وغیرہ کی ایذا ہی سہنا ہے تو اس کو سہے اور اس تدارک کو نہ کرے۔

(۷) سر کو پانی کے اندر لے جاکر ڈبونا۔ اس کی قدر پوچھئے گرمی کے زمانے میں روزے کے عالم میں صاف ٹھنڈے حوض میں اترنے والوں سے جن کا دل پانی کو دیکھ کر لہریں لینے لگا ہو اور بیساختہ دل چاہتا ہو کہ ایک غوطہ مگر حکم کی پابندی سدِ راہ

(۸) خدا اور رسولؐ اور ائمہ معصومین علیہم السلام پر جھوٹ باندھنا یعنی کسی قول یا فعل کو ان حضرات میں سے کسی بزرگ کی جانب غلط طور پر منسوب کرنا۔

اسکی زد زیادہ تر مقررین اور ذاکرین پر پڑتی ہے۔ روزہ کی مجلس، ایک تو یوں ہی نہیں چلتی، ادھر زبان بیان خشک اور ہونٹ پپڑائے ہوئے۔ طاقت ساتھ نہیں دیتی۔ ادھر سامعین نیند کے جھونکوں میں، مجسمہ خاموشی بنے سن رہے ہیں اور اثر نہیں لیتے، ذہن میں ایک ٹکڑا موجود ہے، روایت میں لگائیں تو مجلس میں گرمی پیدا ہو جانے کی امید ہے مگر معلوم ہے کہ اس کی کوئی اصلیت نہیں۔ اگر کہیں یہ غلط روایت بیان کی اور ائمہ کی طرف کسی امر کی نسبت ہوئی جو صحیح نہیں تو مجلس معلوم نہیں پھر بھی چلے یا نہ چلے لیکن روزہ ضرور چلا جائے گا اب پہلے سے منبر پر سے کورا اقدام ہو لیکن بیان اتنا ہی کیجیے جتنا آپ کے نزدیک صحیح ہے۔

ماہ صیام کا چاند

فصلوں کا تغیر و تبدل آفتاب کے لحاظ سے ہوتا ہے اور اُس سے طبعی خصوصیات

بھی اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ نجومی لوگ ستاروں کو کائنات میں اثر انداز سمجھتے ہیں اور حوادث کا تعلق اس سے قرار دیتے ہیں اسلام نے نہ آفتاب کا لحاظ کیا ہے نہ ستاروں کا کیونکہ دونوں باتیں غیر حسی ہیں۔ جو حساب جانتے ہیں وہ سمجھیں اس نے چاند کا اعتبار کیا ہے جو محسوس امر ہے۔ اگر ایک مہینہ میں دھوکا بھی ہو جائے تو دوسرے مہینے اس کی صحت ہو جائے گی۔ عالم سے عالم اور جاہل سے جاہل دونوں چاند کو اپنی آنکھ سے دیکھ کر مہینے کی ابتدا اور انتہا کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ ماہ رمضان کو روزوں کا زمانہ قرار دیا ہے اس کا بھی تعلق چاند سے ہے جب چاند ہو گیا روزہ واجب، جب چاند ہو گیا روزوں کی میعاد ختم۔ اصل ذریعہ اس کے علم کا مشاہدہ ہی ہے لیکن اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان کچھ کاموں میں معروف رہے۔ چاند کی تحقیق کو اپنی آنکھ سے دیکھنے نہ جا سکا۔ یا مطلع ابر سے گھرا ہوا اور غبار آلود ہے اس لئے چاند ہوا اور نہ دکھلائی دیا۔ تو اس کے لئے کچھ اور ذرائع بھی قرار دئے گئے۔ چنانچہ دوسرا ذریعہ ہے، دو عادل شخصوں کی گواہی۔ عادل یعنی جن کی فرض شناسی اور پرہیزگاری پر اطمینان ہو۔ شرط یہ ہے کہ ان کے قول کے خلاف وثوق نہ حاصل ہو۔ یہ ضمیر سے متعلق بات ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مطلع بالکل صاف۔ بڑے بڑے تیز نظر جوان آدمی چاند کو دیکھنے میں کوشاں۔ خود آپ کی بھی نگاہ اچھی خاصی تیز ہے اور آپ نے خود بھی پوری کوشش سے دیر تک ڈھونڈا اور چاند دکھلائی نہ دیا۔ اور نہ شہر بھر میں کسی نے دیکھا۔ بس دو ضعیف العمر دھندلی نگاہ والے انسان گواہی دیتے ہیں کہ ہم نے چاند دیکھا۔

ہیں یہ متقی اور پرہیزگار یقین ہے کہ جھوٹ نہ بولیں گے مگر دل کہتا ہے کہ انہیں دھوکا ہوا ہے چاند ہرگز نہیں ہوا ہے ورنہ آخر کوئی اور بھی دیکھتا۔ اس صورت میں

میں اپنے ضمیر اور اطمینان کے خلاف ان عادلوں کی گواہی ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔

(تیسرے) مجتہد کا حکم کہ چاند ہو گیا۔ لنشرطیکہ ہے کہ آپ کو اطمینان ہو کہ مجتہد کے پاس ایسا ثبوت چاند کا پہنچ گیا ہے جو خود ہمیں بھی اگر پہنچتا تو ہمیں عمل اس پر لازم ہوتا۔

(چوتھے) یہ کہ چاند ہو جانا اس طرح زبان زد خلائق ہو جس سے انسان کو یقین پیدا ہو جائے یا ایسا وثوق و اطمینان جس کے خلاف احتمال عقلی طور پر ناقابل لحاظ ہو۔

(پانچویں) یہ کہ شعبان کے تیس دن پورے ہو جائیں۔

اور ایسے ہی ذرائع سے شوال کا چاند بھی ثابت ہوگا جس کا نتیجہ ہے کہ روزہ رکھنا انسان کے لئے حرام ہو جائے۔

متقدمین علماء و محدثین میں ایک بڑی بحث چلی تھی اس بات کی کہ ماہ صیام تیس دن سے کم ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس پر بڑے بڑے رسالے لکھے گئے۔ بات یہ ہے کہ بعض احادیث اس قسم کے وارد ہو گئے ہیں کہ ماہ رمضان ۳۰ دن سے کم نہیں ہوتا۔ محققین اہل نظر کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ ثواب ماہ رمضان کا ہر حال کامل ملے گا۔ چاہے چاند ۲۹ ہی کا کیوں نہ ہو جائے۔ یہی عدل الٰہی کا تقاضا بھی ہے کیونکہ چاند کا ۲۹ کا ہو جانا انسان کے بس سے باہر ہے اور اطاعت شعار بندہ کی نیت یہ ہے کہ وہ تیس کا بھی مہینہ ہو تو سب روزہ رکھے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ۲۹ کا چاند ہونے سے اس کے ثواب میں کمی کر دی جائے۔

نیت

حصہ دوم و سوم میں وضو اور نماز کے باب میں واجبات العبادہ کی حقیقت اور نیت

نظاہر ... گی

کی اہمیت پر کافی تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ روزہ بھی ان واجبات میں سے ہے جن کی صحت قصد قربت پر موقوف ہے اور بغیر نیت وہ درست نہیں ہو سکتا۔ مگر بحث پڑ گئی ہے اس بات میں کہ ماہ رمضان کے تمام مہینے کے روزوں کے لئے ایک نیت کافی ہے یا ہر روز کی نیت الگ الگ ہونا چاہیے۔ اس بحث کے تصفیہ کے لئے ہم کچھ تمہیدی امور کے بیان کرنے کی ضرورت ہے جن پر اس کا دارو مدار ہے۔

(۱) یہ کہ نیت عقلی امر ہے۔ جو بھی عمل ایسا ہوگا کہ اس کا مقصد کسی خارجی نفع اور فائدہ کے طور پر متعین نہ کیا گیا ہو۔ اُسے بر بنائے حکم حاکم ہی بجا لانا چاہیے اسی طرح اگر معلوم ہو جائے کہ اس حکم کا مقصد فرض شناسی کا پیدا کرنا ہے تو بھی عقلی طور پر اس عمل کو قصد اور ارادہ اور احساس فرض کے ساتھ انجام پانا چاہیے اسی کا نام نیت ہے۔ اس لئے نیت کے باب میں عقل کا فیصلہ قابل قبول ہے اور ضرورت منقولی دلائل کی نہیں ہے۔

(۲) نیت ارادہ کی ایک خصوصی صورت ہے اور وہ وہ چیز ہے جو محرک عمل ہوتی ہے اس لئے ارادہ کے لوازم اور خصوصیات ذاتی نیت سے جدا نہیں ہو سکتے۔

(۳) ارادہ وہ کیفیت نفسانیہ ہے جو تحریک عمل پیدا کرتی ہے۔ اس کے لئے مبادی و مقدمات ہیں۔ تصور عمل میلان نفس یعنی شوق و رغبت۔ شرائط و موانع پر نظر کر کے جزم۔ پھر ایک خاص ہیجان نفسی جس کا آخری درجہ حرکت عضلات یعنی ان اجزائے بدن کے متحرک ہونے سے کہ جن کے ساتھ عمل کا تعلق ہے ظاہر ہوتا ہے۔

(۴) محرک عمل وہی ہیجان نفس ہو سکتا ہے کہ جو عمل سے متصل ہو لیکن اگر عمل سے جدا ہے تو وہ محرک عمل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے وہ شے کہ جو عمل کے وقت آنے سے

پہلے انسان میں پائی جاتی ہے اسے ارادہ کہنا عرفی محاورہ ہے جس کو حقیقت سے تعلق نہیں ہے۔ وہ ابتدائی درجے ارادہ کے ہو سکتے ہیں جیسے شوق، عزم یا جزم مگر ارادہ تو نفس کے ہیجان کا آخری درجہ ہے جس کے بعد فعل کا وجود ضروری ہو جاتا ہے۔ اور اگر ہیجان اس درجے تک نہ پہنچے تو فعل کا صدور غیر ممکن ہے مثال کے طور پر یہ دیکھیے کہ آپ کو اس وقت ارادہ ہو اور حتمی ارادہ ہو کہ ۶ بجے شام کو میں امین آباد جاؤں گا لیکن اگر اس وقت آپ سو رہے ہیں یا بیدار ہیں مگر اس خیال کو اپنے بھولے ہوئے ہیں تو ہرگز آپ کا وہ صبح والا ارادہ اس وقت محرک عمل نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر آپ نیند میں گھر سے نکل جائیں اور آنکھیں بند کئے ہوئے اتفاق سے امین آباد پہنچ جائیں تو یہ ایک غیر اختیاری امر سمجھا جائے گا وہ صبح والا ارادہ اس عمل کے اختیاری قرار پانے کا موجب نہ ہوگا۔ اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ ارادہ جو عمل کے اختیاری طور پر صادر ہونے کا معیار ہے وہ وہی چیز ہے کہ جو عمل سے متصل ہوتی ہے اور عمل سے قبل اس کا پایا جانا جب کہ درمیان میں فاصلہ ہو گیا ہو اس عمل کا سبب اور اس کے اختیاری ہونے کا موجب نہیں بن سکتا۔

اب یہ ملاحظہ کیجیے کہ یہ ۳۰ دن کے روزے جو رکھے جاتے ہیں تو سب ایک ہی عمل ہے یا متعدد اعمال ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ عمل کی وحدت ابتدا و انتہا کے حدود کے اندر اتصال کے ساتھ قائم ہوتی ہے۔ اور جب انقطاع ہو گیا اور دوبارہ ابتدا ہوئی تو یہ عمل چاہے جنس اور نوعیت میں پہلے عمل کے ساتھ متحد ہو مگر شخصی حیثیت سے اس سے جدا ہے پھر جب کہ ہر روزہ کی انتہا افطار پر ہو جاتی ہے تو ان تمام روزوں کو ایک عمل کیسے سمجھا جا سکتا ہے۔

یقیناً ان میں سے ہر روزہ ایک علیحدہ تشخص رکھتا ہے اور جداگانہ وجود ہے۔
اب دیکھئے کہ پہلے روزہ کی جو نیت کی تھی چاہے وہ تمام روزوں کے متعلق ہو لیکن پہلے روزہ سے تو وہ متصل ہے اور اس لئے اس روزہ کے لئے فوراً تحریک عمل پیدا کرسکتی ہے مگر بعد والے روزوں کے لحاظ سے وہ علیحدہ ہونے کی بنا پر تحریک کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اور ان روزوں کے لحاظ سے وہ ارادہ کی اس منزل پر ہے جو صدور فعل کا باعث ہوتی ہے۔ اسے اگر سمجھا جاسکتا ہے تو ان روزوں کی نسبت عزم یا جزم بس اس سے زیادہ نہیں۔ اب اگر یہ عزم قائم رہا اور تصور و شوق کے تمام مبادی دوسرے روزہ کے موقع پر ثابت ہوئے تو یہی عزم ارادہ کی شکل اختیار کرلے گا اور وہ ارادہ دوسرے روزہ کی نیت قرار پائے گا لیکن اگر دوسرے روزہ کے موقع پر اس کے ذہن میں وہ پہلا خیال موجود نہ ہوا اور یہ غفلت اور فراموشی کے عالم میں ہوا تو وہ عزم اپنے وقت میں ختم ہو چکا۔ اب اس وقت اس میں صلاحیت نہیں کہ وہ محرک عمل بن سکے پھر کیسے کہا جاتا ہے کہ وہ اس دوسرے روزہ کے لئے بھی نیت کا درجہ رکھتا ہے۔ ثمرۂ اختلاف دونوں صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے اس وقت کہ جب ایک رات شام سے جو سویا تو پھر دن بھر بیدار رہا۔ درمیان کا دن سونے میں بسر ہوا ہے اور اس لئے نیت آج کے روزہ کی نہیں ہوئی۔ لیکن اگر وہ پہلی نیت جو ۳۰ دن کے روزوں کی کر لی تھی محرک سمجھی جائے تو یہ درمیانی دن روزہ میں محسوب ہو گا۔ دوسری صورت کسی دن اسے روزہ کا خیال ہی نہ آیا۔ بے شک اتفاقاً یوں ہی فاقہ سے بھی رہا اور کچھ کھایا پیا نہیں تو اگر پہلی نیت کو کافی سمجھا جائے گا تو اس دن روزہ

صحیح مانا جائے گا۔ بلکہ پہلی نیت کے کافی سمجھنے کا تقاضا تو یہ ہے کہ اگر دن بھر کھاتا پیتا بھی رہے تب بھی روزہ میں حساب ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ مفطر صوم جو ہے وہ عمداً کھانا اور پینا ہے۔ جس طرح اگر آج ہی روزہ کی نیت کر چکا ہوتا تو پھر اگر بھولے سے یہ کچھ کھا پی لیتا تو روزہ باطل نہ ہوتا ایسے ہی اگر پہلی نیت کافی ہو تو اس شخص کے دن بھر کھانے پینے سے روزہ باطل نہ ہو۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے معلوم ہوا کہ پہلی نیت روزہ کی صحت میں کافی نہیں ہے۔ اسی سے ایک اور نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر آپ شب کے کسی حصہ میں اس قصد سے کہ اب ہم ترک کرتے ہیں سو رہیں اور پھر آنکھ نہ کھلے اور دوبارہ نیت کرنے کا موقع نہ ملے یہاں تک کہ صبح ہو جائے یا وہ پھر دن بھی گذر جائے تو روزہ صحیح ہو گا کیونکہ یہ پورا زمانہ جو اس ترک کے وقت سے افطار تک ہے اتصال کی وجہ سے ایک واحد عمل یعنی امساک مفطرات سے باز رہنا ہے اور وہ قصد و نیت کے ساتھ انجام پا رہا ہے جو اسی سے متصل ہے لیکن اگر اس قصد سے سوئے کہ ابھی ہم اٹھیں گے اور کھائیں پئیں گے پھر روزہ رکھیں گے اور اس کے بعد پھر آنکھ نہ کھلے یا کھلے اور روزہ کا خیال نہ ہوئے اور قصد نہ پیدا ہو یہاں تک کہ دوپہر گذر جائے تو یہ روزہ حساب میں نہیں ہوئے گا کیونکہ وہ قصد جس کے ساتھ یہ سویا تھا۔ امساک کا اسی وقت سے نہ تھا۔ بلکہ کسی بعد کے وقت میں اٹھنے پر کھانے پینے کے بعد امساک کا قصد ہے اور وہ وقت موقع اس قصد سے علیحدہ تھا اور فاصلہ رکھتا تھا۔ اس لئے یہ قصد اس امساک کے لئے محرک نہیں بن سکتا تھا اور وہ موقع جب آیا تو اس وقت اسے قصد پیدا نہیں ہوا لہٰذا نیت کہ جو صحت عمل کے لئے ضروری ہے یہاں متحقق نہیں ہوئی۔

روزے کی صحت میں ایک خاص رعایت

اُصولاً اگر کوئی عمل بہت سے اجزاء سے مرکب ہو یا ایک خاص مدت تک قائم رہنے والا ہو تو ان تمام اجزاء کے حصول اور اس تمام مدت میں عمل کو قصد و ارادہ کے ساتھ ہونا چاہیے تب ہی وہ عمل صحیح ہوگا لیکن اگر ایک جزو بھی کم ہو گیا یا وقت کا کوئی حصہ بھی خارج ہو گیا تو عمل کو باطل ہو جانا چاہیے اگر کوئی خاص تصریح قانون میں اس کے خلاف نہ آئے تو قاعدہ کا اقتضا یہی ہے مگر جیسے جماعت کی نماز میں یہ مراعات کیگئی ہے کہ اگر رکوع میں بھی شریک ہو جائے تو رکعت حساب میں آجاتی ہے اور نماز صحیح ہو جاتی ہے اُسی طرح روزہ کے باب میں شرع نے یہ ایک خاص رعایت کی ہے کہ روزہ واجبی میں اگر انسان نے کچھ کھایا پیا نہ ہو تو زوال کے قبل تک نیت ہو سکتی ہے اور مستحبی روزہ میں اس سے بھی زیادہ رعایت کی گئی ہے کہ بعد زوال بھی غروب کے وقت کے قبل جس وقت سے قصد روزہ کا پیدا ہو جائے بشرطیکہ کچھ مفطرات صوم کا اس دن استعمال نہ ہوا ہو تو وہ روزہ حساب میں آجائے گا یہ صرف خدائے کریم کا ایک فضل و احسان اور انسان کے رجحان عبادت کی ایک قدر افزائی ہے بدقسمت ہے انسان اگر اب بھی نعمت ثواب کے حصول کی طرف قدم نہ بڑھائے۔

ایک اور رعایت

عبادت کو شروع کرنے کے بعد ناتمام نہیں چھوڑنا چاہیے ارشاد ہوا ہے لا تبطلوا اعمالکم اگرچہ دوسرے معنی بھی ہیں لیکن علماء نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ عمل کو آغاز کے

بعد انجام تک پہنچانا ضروری ہے۔ نماز کا وقت اگرچہ وسیع ہو یعنی اگر نماز کو توڑ ڈالے تو پھر بھی وقت کے اندر نماز پڑھ لے گا مگر بلا ضرورت کے اس کا توڑنا جائز نہیں ہے لیکن روزہ کے باب میں یہ خاص رعایت رکھی گئی ہے کہ واجبی روزہ ہو ایسا جسے بعد میں بھی ادا کیا جا سکتا ہے جیسے قضائے ماہ رمضان جب کہ ابھی سال کے دن ان روزوں کی تعداد سے زیادہ باقی ہوں یا نذر غیر معین کا روزہ تو اسے ظہر کے قبل تک انسان توڑ سکتا ہے۔ اور اگر مستحبی روزہ ہو تو اسے شام تک جس وقت چاہے ترک کرے گا۔ یہ بھی نفسیات انسانی کے لحاظ سے وقت اور مواقع کی پیش بندی کے لحاظ سے دواعی و اسباب و حالات کی خاطر داری ہے اور یہ اسلام کی اس عام معیاری خصوصیت کے مطابق ہے جو ہر شعبۂ زندگی میں فرض شناسی کے احساس کے باقی رکھنے کے ساتھ امکانی سہولت بھی پیدا کرنا چاہتا ہے۔

رعایت بالائے رعایت

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شعبان کا ۲۹ تاریخ کا چاند مشکوک رہا ۳۰ تاریخ تک شبہ ہے کہ شاید چاند ہو گیا ہو تو آج پہلی رمضان کی ہے لیکن چاند کا ثبوت نہیں ہے اس کو یوم الشک کہتے ہیں۔ یہاں چونکہ ثبوت ماہ رمضان نہیں ہے اور حالت سابقہ کے برقرار ہونے کا اقتضاء یہ ہے کہ آج کا دن ماہ شعبان ہی میں حکم شرعی کے لحاظ سے داخل سمجھا جائے اسلئے یہ حق نہیں ہے کہ آج کا روزہ ماہ رمضان کی نیت سے رکھا جائے لیکن اگر روزہ ترک کرے تو ایک ماہ رمضان کے اس صوم کی خصوصیت سے محروم رہ گیا دوسرے یہ کہ بعد میں قضا کرنا پڑے گی جو طبیعت پر گراں گزرجاتی ہے

اور بلا وجہ ایسا ہونا بھی نہیں چاہیئے۔ اس لئے یہ صورت قرار دی گئی ہے کہ بہتر ہے
کہ آج کا روزہ استحباب کی نیت سے رکھ لے پھر اگر معلوم ہوا کہ یہ دن ماہِ رمضان
کا تھا تو وہ روزہ اسی حساب میں آجائے گا اور پھر قضا کی ضرورت نہ ہو گی۔ یہ بھی
خدا کا ایک فضل و احسان ہے ورنہ اصولاً جب وہ ماہ شعبان کی نیت سے رکھا گیا
تو اس کے ماہ صیام میں آنے کی صورت؟ مگر وہ تو نیت کے اندر کی ضمیر کی گہرائی کو بھی
دیکھتا ہے اسے معلوم ہے کہ اس نے استحباب کی نیت صرف اس لئے کی ہے کہ اس
کے محدود ذرائع علم میں چاند ثابت نہیں ہوا لیکن اصل میں اس کا روزہ رکھنا آج صرف
اس برکت کے حاصل کرنے اور اس فرض کے نظر انداز نہ ہونے کے لئے ہے جو ماہ رمضان
کے روزہ کی شکل میں اس پر عائد ہے۔ اس لئے وہ اس نیت کے باطنی جذبہ پر جزا
دینے کے لئے تیار ہے اور اس روزہ کو ماہ صیام میں حساب کر لیتا ہے۔

ترک صوم کا کفارہ

ایک دن بھی روزہ اگر عمداً ترک کرے تو کفارہ واجب ہے ساٹھ مسکینوں کا
کھانا کھلانا یا دو مہینے کے مسلسل روزے رکھنا یا بندہ راہ خدا میں آزاد کرنا۔
آج جب کہ بردہ فروشی قانوناً ممنوع ہے تو پہلی دو صورتوں میں انحصار ہے
مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ کفارہ ایک جرمانہ ہے جس کا ادا کرنا انسان کے لئے لازم ہے
لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ترک صوم اس کفارہ کے ادا کرنے کے ساتھ جرم نہیں باقی
رہا وہ گناہ جو اپنے وقت پر ترک صوم کا ہو گیا۔ بہر حال گناہ ہے اور اس کے لئے توبہ
کی ضرورت ہے مطلب یہ ہے کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی صاحب دولت شخص اپنا وتیرہ ہی

یہ قرار دے لے کہ روزہ ترک کر دیا کرے اور پھر ہر روزہ کے عوض ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دیا کرے۔ یہ طرز عمل اُس کا ہرگز درست نہیں ہوگا اور وہ اخروی پاداش سے ترک صوم کی بچ نہیں سکتا جس طرح اگر فعل حرام کے ساتھ انسان روزہ کو ترک کرے۔ مثلاً ماہ صیام کے روزہ کے بجائے معاذ اللہ شراب خوری کرے یا ناجائز طور پر عورت سے تعلقات خاص قائم کرے تو ایسے شخص کے لئے تینوں کفارے ایک ساتھ دینا لازم ہیں مگر اس سے نہ اُس فعل حرام کی حرمت برطرف ہوگی۔ نہ روزہ کے ترک کی اہمیت، بیشک اگر یہ کفارہ بھی نہ دے تو ایک تیسرا جرم ہوگا اس جرم سے بچنے کے لئے عقلی طور پر کفارہ دیدینا لازم ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ واجبات جو خاص اوقات کے ساتھ مشروط ہیں اور جن کی قضا کا بعد میں حکم ہے ان میں ایک مطلوب تو اصل فعل کا انجام دینا ہے دوسرا مطلوب اُن کا وقت خاص میں واقع ہونا ہے اگر ایسا نہ ہوتا اور اصل مقصد صرف کام کا انجام پانا ہوتا تو واجب میں خصوصیت وقت کے ساتھ حکم ہی نہ ہوتا بلکہ غیر موقت طور پر اس کا حکم ہوتا اور اگر مطلوب ہوتا صرف وقت خاص میں وقوع پذیر ہونا تو پھر وقت گزرنے کے بعد قضا کا حکم نہ ہوتا لیکن چونکہ دو مطلوب الگ الگ ہیں اس لئے اگر اصل وقت پر نہ بجا لائے تو گناہ گار ہوگا اس لئے کہ وقت کی خصوصیت ہاتھ سے دیدی لیکن پھر بھی حکم ہے کہ اُس کو دوسرے وقت بجا لائے تاکہ وہ دوسرا مطلوب یعنی اصل فعل کی بجا آوری تو حاصل ہو جائے اگر اُس نے بعد میں اُس فعل کو انجام نہ دیا تو یہ ایک دوسرا گناہ ہوگا۔ یونہی جس مقام پر کفارہ کا حکم ہے یہ ایک تیسرا مقصد ہے اور وہ یہ کہ اس جرم کا ایک تاوان وہ اس دنیا میں بھی دیدے لیکن نہ اس سے وہ وقت کی خصوصیت

کا منشا حاصل ہوتا ہے تاکہ وہ گناہ برطرف ہو۔ نہ اصل فعل کی بجا آوری ہوتی ہے تاکہ قضا کی ضرورت نہ ہو بلکہ اس کفارہ کے ادا کرنے کیسا تھ اصل فعل کی بجا آوری کیلئے قضا بھی ضروری ہے اور وقت پر نہ بجا لانے کے گناہ کیلئے سچے دل سے توبہ کی بھی ضرورت ہے اس کے ساتھ پھر یہ کفارہ بھی ادا کرے تو انشاء اللہ پھر آخرت میں کوئی بازپرس نہ ہوگی اس امر کے متعلق کہ اس قضا و کفارہ سے اصل وقت کی خصوصیت جو فوت شدہ ہے نصیب نہیں ہوتی اور اس لئے انسان کو اس پر ندامت ہونے کی ضرورت ہے حدیث معصوم بھی موجود ہے۔ ملاحظہ ہو سماعہ بن مہران کی روایت اُن کا بیان ہے کہ میں نے معصوم سے دریافت کیا اُس شخص کے متعلق جو ماہ رمضان میں جان بوجھ کر اپنی عورت سے مقاربت کرلے حضرت نے فرمایا اس کا کفارہ ہے بندہ آزاد کرنا اور ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا اور دو مہینے کے پے در پے روزے رکھنا۔ اس کے علاوہ اُس دن کی قضا بھی لازم ہے وانی لہ مثل ذلک الیوم اور بھلا وہ دن اب کہاں نصیب؟ اس سے ظاہر ہے کہ اس دن روزہ رکھنے سے جو مقصد تھا وہ اب حاصل نہیں ہو سکتا اس لئے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ یہ قضا و کفارہ اس کا پورا پورا بدل ہو گیا۔

ہمارے والد ماجد[1] اعلی اللہ مقامہ کے مقلد ایک رئیس صاحب نے یہ دریافت کرنے کے بعد کہ ایک روزہ کا کیا کفارہ ہوتا ہے اپنا دستور مقرر کر لیا کہ وہ روزے ماہ رمضان کے ترک کریں اور پھر ساٹھ آدمیوں کو کھانا کھلا دیا کریں۔ اس پر جناب مغفور نے ایک تفصیلی جواب سوال کا تحریر فرمایا جو اس موقع پہ درج کیا جاتا ہے۔

سوال

اگر کوئی شخص روزہ ماہ رمضان بلا عذر شرعی عمداً نہ رکھے یہ خیال کرکے کہ ایک روزہ

---

[1] ممتاز العلما مولانا السید ابو الحسن اعلی اللہ مقامہ فی دار الکرامہ
[illegible]

کی قضا و کفارہ دے دوں گا یہ فعل اس شخص کا جائز ہے یا ناجائز اور شخص مذکور ہمیشہ ایسا ہی کیا کرے کہ روزہ ماہ رمضان کا بلا عذر شرعی عمداً نہ رکھے اور قضا و کفارہ کو ادا کر دیا کرے تو گناہگار ہوگا یا نہیں اور قضا و کفارہ صیام ماہ رمضان سے کافی ہو جائے گا یا نہیں جواب تفصیلی مرحمت ہو۔

جواب

مخفی نہ رہے کہ شریعت میں واجب کئی طرح کا ہے۔ منجملہ اقسام واجب کے جو محل بحث ہمارے مسئلہ کا ہے واجب عینی و واجب تخییری ہے۔ فرق واجب عینی و تخییری میں یہ ہے کہ واجب عینی وہ واجب ہے جس کا بدل اور نہیں کی مصلحت کو پورا کرنے والا دوسرا فعل نہیں ہوتا۔ بخلاف واجب تخییری کے۔ واجب تخییری میں اُس مصلحت کے پورا کرنے والے جو اس واجب میں نظر شریعت میں ہے دو فعل یا زیادہ ہوتے ہیں۔ مثلاً نماز جمعہ و صلوٰۃ ظہر۔ اگر وجوب تخییری کے قائل ہوں تو دونوں نماز جمعہ اور نماز ظہر اُس مصلحت کے لئے جو نظر شارع میں ہے کافی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ واجب تخییری میں مکلف کو شرع کی جانب سے اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ خواہ اس فعل کو بجا لائے خواہ دوسرے فعل کو مگر واجب عینی میں اختیار دو فعلوں میں یا نامد میں نہیں ہوتا بلکہ اُسی فعل کا خود بجا لانا ضروری ہوتا ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ اگر نظر شریعت میں اس کے فعل کے بجا لانے سے معذور ہو خوف ضرر وغیرہ کی وجہ سے تو دوسرا فعل اضطراری حالت میں اس کا بدل قرار دیا جائے جیسے تیمم وضو کا بدل اضطراری ہے۔

نماز روزہ واجبات عینیہ میں سے ہیں لہذا کوئی دوسرا فعل اس کی مصلحت پورا

www.kitabmart.in

کرنے والا نہیں سمجھا جاسکتا اور اس لئے اگر کوئی شخص روزہ یا نماز ترک کرے۔ تو چاہے بعد
کو قضا بھی کرلے یا روزہ عمداً بدون عذر شرعی ترک کرکے کفارہ بھی دیدے تب بھی گنہگار
ہوگا اور قضا و کفارہ یا تنہا قضا فوت شدہ روزہ یا نماز کے مفاد کو پورا نہیں کرسکتا اور
اور اس سے اصل فعل کے اس وقت پر ترک کرنے کا گناہ برطرف نہیں ہوسکتا جب تک
کہ توبہ نہ کرے۔ اسی طرح اگر توبہ کے بعد تلافی مافات نہ کرے اور قضا و کفارہ یا قضا روزہ
اور نماز کے ترک کے بعد نہ کرے تو محض توبہ کافی نہیں ہے۔ اگر قضا و کفارہ روزہ میں
یا تنہا قضا نماز میں اس عبادت کے مفاد کو پورا کردے تو نماز و روزہ واجب عینی نہ رہے گا
بلکہ واجب تخییری ہوجائے گا اور یہ بالاجماع باطل ہے۔

یہ خیال کہ ترک صوم و صلوٰۃ کے بعد جو حکم تھا اس پر عمل کرلیا یعنی ترک صوم میں قضا
و کفارہ اور ترک صلوٰۃ میں قضا پر عمل کرلیا تو اب سزا کیوں ہو اور اگر سزا بہرحال ملنا ہے
تو پھر قضا و کفارہ سے کیا فائدہ ہے؟! درست نہیں ہے اس لئے کہ ہمارا فرقہ عدلیہ امامیہ
اثنا عشریہ اس کا قائل ہے کہ احکام شرعیہ مصالح و مفاسد واقعیہ کے تابع ہیں۔ بے شک کبھی
مصلحت ذات فعل میں ہوتی ہے اور وقت و مکان کو مدخلیت نہیں ہوتی اور بعض افعال
ایسے ہیں جن میں وقت یا مکان کی خصوصیت ملحوظ ہے۔

نماز ہائے یومیہ اور صیام ماہ مبارک رمضان ایسے ہی واجب ہیں جن میں وقت کو
مدخلیت ہے روزہ ماہ مبارک رمضان اور مثلاً نماز ظہر کے ترک کے بعد وہ خصوصیت وقتیہ
ادا نہیں آسکتی لہٰذا اس خصوصیت وقت کے ہاتھ سے دے دینے پر اگر بعد قضا و کفارہ
یا محض قضا کے بعد گناہ باقی رہے تو کوئی عجب بات نہیں ہے۔ اب رہ گیا یہ امر کہ جب گناہ
باقی رہتا ہے تو حکم قضا و کفارہ کیوں ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قضا و کفارہ کے بعد